سلسلۂ مطبوعاتِ اِدارۂ ادب و تنقید، لاہور۔ نمبر ۱۸

ڈاکٹر عبادت بریلوی

جہانِ میر

میر تقی میر کی ادبی و تنقیدی سوانح

اِدارۂ ادب و تنقید ○ لاہور

سلسلۂ مطبوعاتِ اِدارۂ ادب و تنقید، لاہور — نمبر ۱۸

ڈاکٹر عبادت بریلوی

جہانِ میر

میر تقی میر کی ادبی و تنقیدی سوانح

اِدارۂ ادب و تنقید ○ لاہور

تصنیف : جہانِ میر
مصنف : پروفیسر ڈاکٹر عبادت بریلوی
ناشر : ناظم ادارۂ ادب و تنقید ، لاہور
مطبع : ظفر سنز پرنٹرز ، کوپر روڈ ، لاہور
سرورق : سید انور حسین شاہ نفیس رقم

جہانِ سیر

فہرست مضامین

اُردو کے نامور محقق ، نقاد اور انشاء پرداز

اُستاد محترم

پروفیسر سید مسعود حسن صاحب رضوی ادیب

کی

یاد میں

جن کی شفقت اور محبت میری زندگی کا بہت بڑا سرمایہ رہی ، اور
جنھوں نے مجھے ادب سے دلچسپی لینے کے آداب اور
ادبی کام کرنے کے گر سکھائے۔

عبادت بریلوی

پیش لفظ

میر تقی میر کی زندگی حرکت اور ہنگاموں سے عبارت تھی۔ انھوں نے تقریباً نوے سال کی عمر پائی، اور اس طرح مغلوں کے دورِ آخر کے کئی بادشاہوں کا زمانہ دیکھا۔ اس زمانے میں جو تاریخی واقعات رونما ہوئے اور اس عہد کے افراد کی انفرادی اور اجتماعی زندگی ان ہنگامہ آرائیوں کے نتیجے میں جس آشوبِ قیامت سے دو چار ہوئی، اس کو انھوں نے نہ صرف اپنی آنکھوں سے دیکھا بلکہ اس میں وہ خود بھی کسی نہ کسی طرح شریک رہے۔ یہی سبب ہے کہ ان کی زندگی ان تمام حالات کے نشیب و فراز کی ایک متحرک اور چلتی پھرتی تصویر نظر آتی ہے۔

اس عہد کی زندگی کو میر صاحب کی زندگی کے آئینے میں اور میر صاحب کی زندگی کو اس عہد کے حالات و واقعات کے آئینے میں بخوبی دیکھا جا سکتا ہے۔ اس لیے کہ یہ دونوں لازم و ملزوم ہیں۔ میر صاحب نے اس زمانے میں آنکھ کھولی جب مغلیہ شان و شوکت کی عمارت بوسیدہ ہو چکی تھی، اور انحطاط و زوال کے عفریت اس کے آنگن میں رقص کر رہے تھے۔ شاہانِ وقت کی حیثیت شاہِ شطرنج سے زیادہ نہیں رہ گئی تھی۔ داخلی خلفشار اور بیرونی یلغار نے زندگی کی بنیادوں کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔

میر نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ دلی کی سرزمین پر انھیں حالات کے سائے میں بسر کیا اور اس زمانے میں جو کچھ لکھا،

اُس میں ان حالات کے اثرات سب سے زیادہ نمایاں ہیں ۔ انھوں نے اپنی شاعری اور نثر دونوں میں ان تمام حالات کی ایسی تصویر کشی کی ہے جس کی مثال اُس عہد کی کسی تحریر میں نظر نہیں آتی ۔ اس اعتبار سے دیکھا جائے تو میر اس عہد کے ایک بڑے مورخ اور اس زمانے کی تاریخ و تہذیب کے ایک بہت بڑے مزاج داں نظر آتے ہیں ۔ انھوں نے اس عہد کے واقعات بھی بیان کیے ہیں ، ان واقعات سے نشیب و فراز کی مصوری بھی کی ہے ، معاشرے پر اُن کا جو اثر ہوا ہے ، اس کا نقشہ بھی بڑے سلیقے سے کھینچا ہے ، اور افراد پر ان حالات کے نتیجے میں جو کچھ گزری ہے ، جذباتی اور ذہنی طور پر وہ جس طرح اس سے متاثر ہوئے ، اس کی تصویر کشی بھی اُنھوں نے بڑی چابک دستی سے کی ہے ۔

خود میر بھی اسی معاشرے کے فرد تھے ۔ اس لیے ان حالات کے اثرات ان کی نجی زندگی کے واقعات میں بھی اپنے آپ کو رونما کرتے ہیں ۔ اس زمانے کے انتشار اور افرا تفری کے نتیجے میں جو پریشانی عام ہوئی تھی ، افلاس نے افراد کو جس طرح زبوں حال کر دیا تھا ، قدروں اور معیاروں کی جس طرح شکست و ریخت ہوئی تھی ، اور نفسا نفسی کی کیفیت پیدا ہو جانے کی وجہ سے افراد کو جس طرح ناکامیوں اور مایوسیوں کا منہ دیکھنا پڑا تھا ، میر کی نجی زندگی اس صورتِ حال کی ایک نہایت ہی المناک اور دلخراش داستان ہے ۔

میر ان حالات میں زندہ رہے ، بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہے کہ زندہ رہنے اور زیست کرنے کی کوشش میں ساری زندگی رواں دواں

رہے ۔ انھوں نے زمانے کی ناسازگاری کے سامنے سپر نہیں ڈالی
برخلاف اس کے زندہ رہنے کے لیے جد و جہد کرتے رہے ۔ اس
جد و جہد میں انسانی اقدار کی پاس داری اور اعلیٰ اخلاقی معیاروں
کا خیال ایک لمحے کو بھی ان کی آنکھوں سے اوجھل نہیں ہوا ۔

اس صورت حال نے میر کو اس عہد کی ایک اہم شخصیت
بنا دیا ہے ۔ ان کی شخصیت کو سمجھنے کا راز ان کی داستانِ حیات
کے مطالعے میں ہے ۔

یہ کتاب ''جہان میر'' ان کی داستانِ حیات کے نشیب و فراز
ہی کا ایک مطالعہ ہے جس کو سوانح کا روپ دے کر ادبی و تنقیدی
رنگ و آہنگ کے ساتھ پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے ۔

میر کی زندگی میں اکبر آباد کی اہمیت ، ان کے آباء و اجداد ،
خاندانی ماحول ، بچپن کے حالات ، فکرِ معاش ، عشق و عاشقی ، تعلیم
و تربیت ، شعر و شاعری ، زندگی میں ان کے مشاغل ، دلی سے ان
کی محبت ، اس سرزمین کی تباہی و بربادی ، اور اس کے نتیجے میں
وہ آشوبِ قیامت جس سے میر کو بھی دو چار ہونا پڑا اور بالآخر
لکھنؤ کی طرف ان کی ہجرت ـــــ میر کی زندگی سے متعلق ان تمام
پہلوؤں کا تذکرہ اس کتاب میں کسی قدر تفصیل کے ساتھ ملے گا ۔ اس
تفصیل میں ایک تخلیقی رنگ و آہنگ کو برقرار رکھنے کی کوشش
کی گئی ہے جس نے میر کی اس داستان حیات کو ناول اور افسانے
کی طرح خاصی حد تک دلچسپ بنا کر پڑھنے کے قابل بنا دیا ہے ۔
لیکن اس کے ساتھ ہی اس میں تحقیق اور تنقید بھی اپنی جھلک
دکھاتی ہے ، کیونکہ اس کے بغیر کوئی بڑی ادبی سوانح اپنا بلند

ادبی مقام حاصل نہیں کر سکتی ، بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ اس کے بغیر وہ ایک ''فن بے اعتبار'' ہی رہتی ہے -

حیات میر کی اس ترتیب و تالیف میں میر کی تحریروں ، آن کی منظوم تخلیقی کاوشوں ، تاریخ کی کتابوں ، معاصر تذکرہ نگاروں کی تحریروں ، ادبی مورخوں کی لکھی ہوئی تاریخوں ، محققوں کی موشگافیوں اور نقادوں کی اندازہ دانیوں سے بھی استفادہ کیا گیا ہے - اس خیال سے کہ میر کی یہ داستان حیات صحیح اور مستحکم بنیادوں پر استوار ہو کر ان کی رنگا رنگ شخصیت کی دلکش و دل آویز تصویر کو آبھار کر آنکھوں کے سامنے لائے اور پڑھنے والوں کے لیے دلچسپی کا سامان پیدا کر سکے -

لاہور ۲۵ جون ۱۹۸۵ — عبادت بریلوی

* * *

پہلا باب

خاکِ پاکِ اکبر آباد

"خاکِ پاکِ اکبر آباد" :

میر صاحب کی اپنی اصطلاح ہے جس کو انھوں نے اس سرزمین مینو سواد میں پیدا ہونے والے شاعروں اور ادیبوں کی وطنی نسبت کا ذکر کرتے ہوئے استعمال کیا ہے ، اور اس سے اس حقیقت کی وضاحت ہوتی ہے کہ اس سرزمین کے ساتھ انھیں جذباتی وابستگی تھی ، اور وہ اس سے والہانہ محبت کرتے تھے ، اس سے گہری عقیدت رکھتے تھے اور اس کا حد درجہ احترام کرتے تھے ۔

اکبر آباد ایک زمانے تک مغلوں کا مستقر اور ایک تہذیبی مرکز رہا ۔ اکبر اعظم نے اس سرزمین کو اعتبار بخشا ، اس کو اپنا وطن بنایا ، اور یہیں سے بیٹھ کر اس برعظیم پاکستان و ہند پر اس طرح حکمرانی کی جس کی مثال تاریخ میں کہیں اور ذرا مشکل ہی سے نظر آئے گی ۔ اس نے یہیں بیٹھ کر ہندو مسلم اتحاد کا خواب دیکھا ، اور اپنی کوششوں اور کاوشوں سے اس کو عملی شکل دینے کی کوشش بھی کی ۔ راجپوتوں سے ازدواجی تعلقات کی استواری مذہبی معاملات میں کشادہ دلی ، زندگی میں انسانی اقدار کی پاس داری ، عالموں ، مفکروں ، شاعروں اور ادیبوں کی قدردانی اور صوفیائے کرام کے ساتھ عقیدت مندی ، جس سے عہد اکبری کو پہچانا جاتا ہے ، اس کے پس منظر میں انسان دوستی اور احترام آدمی کے تصورات کارفرما نظر آتے ہیں ۔

پہلا باب

خاکِ پاکِ اکبر آباد

"خاکِ پاکِ اکبر آباد" :

میر صاحب کی اپنی اصطلاح ہے جس کو انھوں نے اس سرزمین مینو سواد میں پیدا ہونے والے شاعروں اور ادیبوں کی وطنی نسبت کا ذکر کرتے ہوئے استعمال کیا ہے ، اور اس سے اس حقیقت کی وضاحت ہوتی ہے کہ اس سرزمین کے ساتھ انھیں جذباتی وابستگی تھی ، اور وہ اس سے والہانہ محبت کرتے تھے ، اس سے گہری عقیدت رکھتے تھے اور اس کا حد درجہ احترام کرتے تھے -

اکبر آباد ایک زمانے تک مغلوں کا مستقر اور ایک تہذیبی مرکز رہا - اکبر اعظم نے اس سرزمین کو اعتبار بخشا ، اس کو اپنا وطن بنایا ، اور یہیں سے بیٹھ کر اس برعظیم پاکستان و ہند پر اس طرح حکمرانی کی جس کی مثال تاریخ میں کہیں اور ذرا مشکل ہی سے نظر آئے گی - اس نے یہیں بیٹھ کر ہندو مسلم اتحاد کا خواب دیکھا ، اور اپنی کوششوں اور کاوشوں سے اس کو عملی شکل دینے کی کوشش بھی کی - راجپوتوں سے ازدواجی تعلقات کی استواری مذہبی معاملات میں کشادہ دلی ، زندگی میں انسانی اقدار کی پاس داری ، عالموں ، مفکروں ، شاعروں اور ادیبوں کی قدردانی اور صوفیائے کرام کے ساتھ عقیدت مندی ، جس سے عہد اکبری کو پہچانا جاتا ہے ، اس کے پس منظر میں انسان دوستی اور احترام آدمی کے تصورات کارفرما نظر آتے ہیں -

یہ انھیں تصورات کا اثر تھا کہ اکبر ، جہانگیر اور شاہجہاں کے ایسے عظیم مغل شہنشاہوں نے اکبر آباد کو نہ صرف حکومت کا دارالخلافہ بنایا ، بلکہ تہذیب و ثقافت اور علم و ادب کا ایک اہم مرکز بھی بنا دیا جس کی وجہ سے اکبر آباد کی خاکِ پاک کی شہرت مشامِ جاں کو معطر کرنے والی خوشبو کی طرح دور دور تک پھیل گئی ، اور اس کے نتیجے میں نہ صرف ہندوستان جنت نشان کے مختلف علاقوں سے اربابِ علم یہاں آکر آباد ہونے لگے ، بلکہ بیرونِ ملک عرب اور ایران و توران سے بھی خاندان کے خاندان کشاں کشاں اس سرزمین پر آئے ، اور انھوں نے اس سرزمین مینو سواد کو اپنا وطن بنا لیا اور ہمیشہ ہمیشہ کے لیے یہیں کے ہو رہے ۔ مغلوں نے کسی پر اس کے دروازے بند نہیں کیے ، بلکہ تاریخ اس بات کی شاہد ہے کہ جو بھی یہاں آیا ، اور جس نے بھی اس سرزمین کو اپنا وطن بنایا ، اس کو انھوں نے کسی نہ کسی طرح اپنی کرم گستری اور سخاوت سے نوازا ۔

مغلوں کی جو حکومت کئی صدیوں تک اکبر آباد میں قائم رہی ، اس کی شان و شوکت اور مضبوطی و استواری کی شہرت دور دور تک پھیل گئی ۔ اکبر ، جہانگیر اور شاہجہاں کا عہد اس اعتبار سے بڑی اہمیت رکھتا ہے ۔ اس زمانے میں کسی کو بھی ہندوستان پر بری نظر ڈالنے کی جرأت نہیں ہوئی ۔ اس زمانے میں کوئی حملہ آور یہاں باہر سے نہیں آیا ۔ مالی خوش حالی ، سیاسی یک جہتی اورنظامِ اقدار کی ہمواری اس زمانے میں اپنے معراج کمال پر پہنچ گئی ۔ مورخوں نے لکھا ہے کہ اس عہد میں ہندوستان اور اس کے دارالسلطنت اکبر آباد پر ہن برستا تھا ، اور نہ صرف بڑے بڑے

مدبر ، فن سپہ گری کے ماہر ، دانشور ، بزرگانِ دین ، صوفیائے کرام ، ادیب اور شاعر اس سرزمین پر اپنے اپنے کاموں میں مصروف رہے ، اور ان سب کے عظیم کارناموں نے اس سرزمین کو صحیح معنوں میں جنت نشان بنا دیا ۔

اکبر اعظم کے زمانے میں ابوالفضل اور فیضی کے ایسے بلند پایہ مصنفوں اور شاعروں کے ساتھ ساتھ موسیقاروں ، مصوروں ، بت تراشوں اور فن تعمیر کے ماہروں نے اکبر آباد کو دنیا کا ایک منفرد شہر بنا دیا ۔ بڑے بڑے پہنچے ہوئے بزرگوں اور درویشوں نے اکبر آباد اور اس کے آس پاس کے علاقوں میں دور دور تک اپنی روحانیت اور معرفت کی روشنی پھیلائی ، اور اپنے اس نور سے نہ صرف خارجی ماحول کو منور کیا بلکہ دلوں کی دنیا کو بھی روشن کر دیا ۔ اس دنیا سے رخصت ہونے کے بعد بھی ان کا یہ فیض جاری رہا ، اور آج تک جاری ہے ۔ شیخ سلیم چشتی تو اکبر آباد کے قطب مانے جاتے ہیں لیکن حضرت خواجہ اجمیری کی درگاہ بھی اکبر آباد سے ایسی کچھ زیادہ دور نہیں تھی ۔ اکبر ، جہانگیر اور شاہجہاں سب ہی ان بزرگوں کے عقیدت مند اور پرستار تھے ، اور اکثر احترام کے خیال سے پیدل چل کر ان کی درگاہوں تک جاتے اور حاضری دیتے تھے ۔

ان تینوں بادشاہوں کے عہدِ حکومت میں یہاں قلعے تعمیر ہوئے ، محل بنائے گئے ، مسجدیں تعمیر ہوئیں ، خانقاہیں اور درگاہیں وجود میں آئیں ، اور شاہجہاں نے اگرچہ اکبر آباد سے اپنا دارالخلافہ دلی منتقل کر دیا ، جہاں لال قلعہ اور جامع مسجد کی ایسی عمارتیں تعمیر کیں لیکن دنیا کے عجائبات میں سے ایک عجوبہ

یعنی تاج محل اس نے دریائے جمنا کے کنارے اکبر آباد ہی کی سرزمین پر تعمیر کروایا ۔

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس سرزمین میں ایک ایسی کشش تھی جس کو الفاظ میں بیان نہیں کیا جا سکتا ۔ چنانچہ اس کشش ہی کا یہ نتیجہ تھا کہ مشرق و مغرب کے تقریباً تمام اہم ملکوں سے لوگ ہجرت کر کے اس سرزمین پر آئے ، اور یہاں کی حکومت نے انھیں اس طرح نوازا کہ پھر انھوں نے یہاں سے جانے کا نام نہ لیا ۔ یہاں کے خیال انگیز ماحول اور رنگین فضاؤں نے ان کا دل کچھ اس طرح موہ لیا کہ وہ اسی خاک پاک کے ہو رہے ۔ بادشاہوں نے انھیں جاگیریں دیں اور بڑے بڑے منصب عطا کیے ۔ شاعروں ، ادیبوں ، مصوروں اور فنِ تعمیر کے ماہروں نے ان کے دلوں کو لبھایا اور درویشوں اور صوفیوں نے ان کے لیے روحانی مسرتوں کا سامان فراہم کیا ۔ غرض اس سرزمین نے انھیں اور انھوں نے اس سرزمین کو ہر طرح سے نوازا ۔ یہ خاک پاک ان کے لیے اور وہ سب اس خاک پاک کے لیے عزت و احترام اور شان و شکوہ کا باعث بنے ۔

اکبر آباد کی اس خاک پاک نے جن بے شمار خاندانوں کے دلوں کو لبھایا ، اور جو یہاں آ کر آباد ہوئے ، ان میں سے ایک میر صاحب کا خاندان بھی تھا ، جس کے افراد نے اس سرزمین کو اپنا وطن بنا لیا ، یہیں آباد ہوگئے اور ہمیشہ اس پر فخر کیا ۔

میر بھی اکبر آباد کی اس خاک پاک سے اپنی وابستگی پر فخر کرتے تھے ۔ اس کا اظہار انھوں نے جگہ جگہ اپنی نثری تحریروں اور شعری کاوشوں میں بڑی شد و مد سے کیا ہے ۔

میر کی زندگی کا زیادہ حصہ ، اس میں شبہ نہیں کہ دلی کی سرزمین پر گزرا لیکن اکبر آباد کا خیال کبھی بھی اُن کے دل سے محو نہیں ہوا ۔ اکثر وہ اپنے اس وطن کو یاد کرتے تھے اور جب بھی موقع ملتا تھا ، وہاں جاتے تھے ، اپنے بزرگوں کے مزاروں پر حاضری دیتے تھے ، در و دیوار کو دیکھتے تھے ، گلی کوچوں کی زیارت کرتے تھے ، جاننے والوں سے ملتے تھے ، درویشوں اور صوفیوں سے ملاقات کرتے تھے ، اور اس شہر کی ہواؤں اور فضاؤں سے اپنے دل کو بہلاتے تھے ۔ میر نے اپنے اکبر آباد جانے کا ذکر ''ذکر میر'' میں کیا ہے ۔ یہ وہ زمانہ تھا جب میر دلی کے مضافات میں راجہ ناگر مل کے ساتھ ان کے قلعوں میں مقیم تھے ، اور جب افغانوں ، مرہٹوں اور جاٹوں کی ہنگامہ آرائیاں شدت سے جاری تھیں ۔ بعد کوئی چار مہینے اس زمانے میں اُنھوں نے اپنے وطن اکبر آباد میں گزارے تھے ۔ وہاں کے بڑے بڑے شاعروں سے اُن کی ملاقاتیں بھی ہوئی تھیں اور اُنھوں نے میر کو ریختے کے فن کا امام سمجھ کر انھیں خراجِ عقیدت پیش کیا تھا ۔ اکبر آباد کے قیام کے دوران وہ صبح شام دریا کے کنارے سیر کے لیے جاتے تھے ۔ ایک طرف باغ تھا ، اور دوسری طرف قلعہ تھا ، اور اُمراء و وزراء کی حویلیاں تھیں ۔ ایک شاعر کی حیثیت سے ان کی شہرت بہت قوی تھی ، اس لیے حسین و جمیل اور خوش پوش شاعر ان سے ملنے آتے تھے ، اور ان کا بڑا احترام کرتے تھے ۔ اس زمانے میں میر دو تین دفعہ شہر کی سیر کرنے بھی گئے ، وہاں کے عالموں ، فقیروں اور شاعروں سے ملے لیکن اطمینانِ قلب انھیں نصیب نہ ہوا ۔ کیونکہ پہلے کی سی فضا اب وہاں نہیں تھی ۔ ایک زمانہ تھا جب اس شہر کی ہر گلی

میں عارف کامل ، فاضل ، شاعر ، منشی ، دانش مند ، فقیہ ، متکلم حکیم ، صوفی ، محدث ، مدرس ، درویش ، حافظ ، قاری موجود تھے ، ہر طرف باغ اور خوبصورت مکان تھے ، لیکن اب وہاں کچھ باقی نہیں رہا تھا ۔ کس سے ملتے اور کن لوگوں سے گفتگو کرتے ۔ بہت دکھ ہوا ، چار مہینے وطن میں رہ کر میر پھر سورج مل کے قلعوں میں واپس آئے ۔

میر کو اپنے وطن اکبر آباد سے بڑی محبت تھی ، لیکن اس کی تباہی نے انھیں آٹھ آٹھ آنسو رلایا ، اور وہ وہاں جا کر کچھ زیادہ ہی پریشان ہوئے ۔ میر نے بڑے جذباتی انداز میں اکبر آباد کی اس صورت حال کا ذکر کیا ہے ۔

اکبر آباد سے وطنی نسبت ان کے لیے بہت بڑی بات تھی ۔ یہی وجہ ہے کہ ''نکات الشعراء'' میں جہاں انھوں نے اپنا حال بیان کیا ہے ، وہاں صرف یہ دو جملے لکھے ہیں :

''فقیر حقیر میر محمد تقی میر ، مؤلف این نسخہ ، متوطن اکبرآباد است ۔ بہ سبب گردش لیل و نہار از چندے در شاہجہاں آباد است'' [۱]

۱ ۔ میر : نکات الشعرا ، صفحہ ۱۵۴ ۔

دوسرا باب

آبا و اجداد اور خاندانی ماحول

میر صاحب کے آبا و اجداد کے حالات کہیں تفصیل سے نہیں ملتے ۔ اس کا ماخذ تو صرف میر تقی میر کی خود نوشت ''ذکر میر'' ہے ، جس میں صرف اتنی معلومات فراہم کی گئی ہے کہ ان کے آباء و اجداد کا وطن حجاز مقدس تھا ـــ اس زمانے میں یہ عام بات تھی کہ عرب اور ایران سے بے شمار شرفا ، نامساعد حالات سے پریشان ہو کر ہندوستان جنت نشان کا رخ کرتے تھے ۔ چنانچہ میر کے آبا و اجداد بھی حجازِ مقدس سے ہجرت کر کے ہندوستان آئے اور پہلے پہل ہندوستان کے دکنی ساحلوں پر اترے ۔ وہاں کچھ عرصے قیام کر کے یہ لوگ احمد آباد گجرات آ گئے ۔ ان میں سے کچھ لوگوں نے اسی سرزمین کو اپنا وطن بنا لیا ، اور وہیں رہ پڑے ، لیکن اس خاندان کے کچھ لوگوں نے قسمت آزمانے کے لیے مغلوں کے دارالخلافہ اکبر آباد کا رخ کیا ـــ اس خیال سے کہ اس سرزمین پر روزگار کے مواقع نسبتاً زیادہ تھے ۔

اکبر آباد آ کر آباد ہونے والوں میں میر کے جد اعلیٰ بھی تھے ۔ ان کا نام معلوم نہ ہو سکا ۔ غالباً میر کو بھی ان کے بارے میں تفصیلات کا علم نہیں تھا ۔ وہ تو صرف اتنا جانتے تھے کہ ان کے جد اعلیٰ نے خاندان کے کچھ دوسرے افراد کے ساتھ احمد آباد سے اکبر آباد کا طویل سفر کیا ـــ وہ اکبر آباد پہنچ تو گئے لیکن اس زمانے کے طویل سفر کی تکان ، اور آب و ہوا کی اچانک

تبدیلی انھیں راس نہیں آئی - چنانچہ وہ بیمار ہو گئے - یہ بیماری ذہنی اور نفسیاتی نوعیت کی تھی - اس لیے ان کی اس بیماری نے خاصا طول کھینچا ، اور وہ جان لیوا ثابت ہوئی - اکبر آباد پہنچنے کے کچھ ہی عرصے بعد ان کا انتقال ہو گیا -

میر صاحب کے یہ جد اعلیٰ کب اللہ کو پیارے ہوئے ، کسی ذریعے سے اس کا کچھ علم نہیں ہوتا - صرف اتنا علم ہوتا ہے کہ وہ کچھ عرصے علیل رہے اور اسی علالت کی وجہ سے انتقال کر گئے - ان کی اولاد میں صرف ایک لڑکا تھا جو میر کے دادا تھے - ان کا نام بھی کسی ذریعے سے معلوم نہیں ہوتا -

میر کے دادا اپنے والد کے انتقال کے بعد تلاش معاش کے سلسلے میں اکبر آباد میں پریشان رہے لیکن اب زمانہ بدل گیا تھا اور مغلوں کے دور آخر کے اکبر آباد میں وہ بات نہیں رہی تھی ، جو کبھی عہد اکبری اور عہد شاہجہانی میں تھی - اکبر آباد میں انھوں نے بہت ہاتھ پاؤں مارے اور برسر روز گار ہونے کی بہت کوشش کی - خاصے عرصے تلاشِ معاش میں پریشان اور سرگرداں رہے - بالآخر بڑی کاوش و کوشش اور تلاش و جستجو کے بعد انھیں فوج میں ملازمت مل گئی ، اور انھیں اکبر آباد کے قریب تعینات کر دیا گیا - اس وقت ان کی عمر پچاس کے قریب تھی - سخت محنت کرنے اور پریشانیوں میں وقت گذارنے کی وجہ سے ان کی صحت خراب ہو گئی اور وہ بیمار ہو گئے - دوا دارو سے کچھ ٹھیک ہو گئے لیکن اسی زمانے میں انھیں نواح اکبر آباد سے گوالیار بھیج دیا گیا - یہ سفر بھی اس زمانے کے لحاظ سے خاصا طویل اور تکلیف دہ تھا - چنانچہ سفر کی صعوبت آب و ہوا کی تبدیلی اور سخت محنت

کی وجہ سے ان کے پرانے ذہنی اور نفسیاتی مرض نے پھر حملہ کیا، اور وہ اب کے جان بر نہ ہو سکے۔ چنانچہ تقریباً پچاس سال کی عمر ہی میں اُن کا انتقال ہو گیا۔

میر صاحب کے دادا نے اپنی اولاد میں دو بیٹے چھوڑے۔ بڑے بیٹے کا دماغی توازن درست نہیں تھا اس لیے وہ ایام جوانی ہی میں انتقال کر گئے۔ اُن کی کوئی اولاد نہیں تھی۔ ان کے چھوٹے بھائی میر کے والد تھے جن کا نام میر محمد علی تھا، لیکن جنھوں نے شروع ہی سے فقر و درویشی کو اپنا شعار بنایا۔ اس لیے میر علی متقی کے خطاب سے مشہور ہوئے۔

میر صاحب نے اپنے آبا و اجداد کے حالات کو مختصر لیکن جامع انداز کے ساتھ اپنی ”کتاب ذکر میر“ میں اس طرح بیان کیا ہے:

”بزرگان من با دار و دستۂ خود، از نامساعد ایام کہ صبح در این مقام شام می نماید، از حجاز رخت سفر بربستہ بہ سرحد دکن رسیدند۔ ناکشیدنیہا کشیدند و نادیدنیہا دیدند۔ از آن جا وارد احمد آباد گجرات گشتند۔ بعض فروکش کردہ از ہم گذشتند و بعض ہمت برین گماشتند کہ پیشتر بیایند و بازوئے تلاش کشایند۔ چنانچہ جد کلان من بہ مستقر خلافت اکبر آباد توطن اختیار کرد۔ این جا از آب گردش ،بربستر افتاد، وجہان آب و گل را دعا گفت۔ از و پسرے باقی ماند کہ جد من باشد۔ او کمر ہمت بربستہ بہ تلاش روزگار برخواست۔ بعد از استخوان شکنی بہ فوجداری گرد۔ اکبر آباد سر افراز گشت۔ آدمیانہ می زیست۔ چون من شریفش بہ پنجاہ کشید، مزاج

از اعتدال منحرف شد۔ چند روز بہ تبرید پرداخت۔ ہنوز صحت کامل نہ شدہ بود کہ بہ گوالیار رفت ، بہ سبب حرکت عنیفی ، کہ در نقاہت سم است ، بجا آفتاد و جامہ گذاشت۔ و او دو پسر داشت۔ کلانے خالی از خلل دماغ نہ بود ، جوان مرد و حکایت او بس سرشد۔ پسر خورد ، کہ پدر من باشد ، ترک لباس کرد ، و پا بہ دامن کشید"۔

میر علی متقی نے اکبر آباد کی سرزمین پر ہوش سنبھالا اور وہیں ان کی تعلیم و تربیت ہوئی۔ انھوں نے اس زمانے کے رواج کے مطابق تعلیم حاصل کی۔ علوم ظاہری کی تکمیل میں مصروف ہوئے اور اس وقت کے ایک خدا رسیدہ بزرگ اور درویش حضرت کلیم اللہ اکبر آبادی کے سامنے زانوئے ادب تہہ کیا ، اور ان کے مرید بھی ہو گئے۔ اپنے مرشد کے فیضِ صحبت نے انہیں خود درویش اور خدا رسیدہ شخصیت بنا دیا۔

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ میر علی متقی دنیا سے 'بے نیاز' ہوگئے اور اُن کا زیادہ وقت عبادت اور ریاضت میں گزرنے لگا۔ دن بھر وہ یادِ الٰہی میں مصروف رہتے۔ رات کو شب بیداری کرتے اور آنسو بہاتے۔ آہ سحرگاہی اور گریۂ نیم شبی کا یہ سلسلہ ساری زندگی جاری رہا۔

وہ قربِ الٰہی کی دولت بیش بہا سے مالا مال ہوئے اور دنیاوی مال و دولت کا خیال انھوں نے اپنے دل سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے نکال دیا۔ عشقِ الٰہی کی سرشاری نے اُن پر ایک عجیب کیفیت طاری کر دی۔ اس کیفیت کو عالمِ جذب یا فنا فی اللہ بھی کہا

جا سکتا ہے - اس کیفیت کے زیرِ اثر وہ اکثر کہتے کہ 'دنیا بیکار جگہ ہے - اس سے دل لگانا بیکار سی بات ہے - اس میں سوائے ہنگامے کے اور کچھ نہیں - انسان کو چاہیے کہ اپنے آپ کو دنیاوی معاملات کی آلائشوں سے پاک رکھے - عشق الٰہی کو اپنا شعار بنائے - کیونکہ دنیاوی زندگی ایک سراب اور دھوکا ہے - اس کی حیثیت سوائے وہم اور خیال کے اور کچھ نہیں - دنیا فانی ہے ، انسانی زندگی بے ثبات اور بے اساس ہے - اصل زندگی تو عاقبت کی زندگی ہے -- اس زندگی میں اسی کے لیے تیاری کرنی چاہیے - صرف خدا کی ذات پائدار ہے اس لیے اسی سے لو لگانی چاہیے - وہ جب بھی اپنے آپ میں آتے تو میر سے اسی قسم کی باتیں کرتے -

اکثر کہتے کہ :

"اے پسر ! زمانہ آن سیّال است ، یعنی بسیار کم فرصت - از تربیت خود غافل مشو - درین راہ نشیب و فراز بسیار است - دیدہ دیدہ برو"[۱] -

اور پھر اکثر یہ بھی فرماتے کہ :

اے پسر ! عشق بورز - عشق است کہ دریں کارخانہ متصرف است - اگر عشق نمی بود نظم دل صورت نمی بست - بے عشق زندگانی وبال است - دل باختۂ بعشق بودی کمال است - عشق بسازد و عشق بسوزد - در عالم ہرچہ ہست ظہور عشق است - آتش سوز عشق است ، آب رفتارِ عشق است - خاک قرار عشق است - باد اضطرار عشق است - موت مستیٔ عشق است ، حیات

---

۱ - میر تقی میر : ذکر میر مرتبہ ڈاکٹر مولوی عبدالحق - صفحہ ۳ -

ہشیاری عشق است ۔ شب خواب عشق است ۔ روز بیداری عشق است ۔ مسلم جمال عشق است ۔ کافر جلال عشق است ۔ صلاح قرب عشق است ۔ گناہ بعد عشق است ۔ بہشت شوق عشق است ۔ دوزخ ذوق عشق است ۔ مقام عشق از عبودیت و عارفیت و زاہدیت و صدیقیت و خلوصیت و مشتاقیت و خلیت و حبیبیت برتر است ۔ جمعے برآنند کہ حرکت آسمانہا حرکت عشقی است یعنی بہ مطلوب نمی رسند و سرگردانند :

بے عشق لباید بود ، بے عشق نباید زیست
پیغمبرِ کنعانی عشق پسرے دارد"[۱]

ظاہر ہے کہ دنیا ، زندگی ، کائنات اور عشق کے بارے میں اس قسم کی باتیں ایک ایسا ہی شخص کر سکتا ہے جو خدا رسیدہ ہونے کے ساتھ ساتھ زندگی کا شعور بھی رکھتا ہو ' اور کائنات کے بنیادی حقائق جس کے سامنے پوری طرح بے نقاب ہوں ۔

میر کے والد ایک ایسے ہی خدا رسیدہ لیکن باشعور شخص تھے ۔ وہ حقائق کو سمجھتے تھے ۔ انہیں کھرے اور کھوٹے کی پہچان تھی ۔ وہ جھوٹ اور ریاکاری کے دشمن تھے ۔ درویشوں کے پرستار تھے ، اور ان کی صحبت کو نعمتِ غیر مترقبہ تصور کرتے تھے ، لیکن جھوٹے اور بنے ہوئے درویشوں کے سخت خلاف تھے ، اور ان کے خلاف جہاد کرنے کو اپنا فرض سمجھتے تھے ۔

"ذکر میر" میں میر صاحب نے ان کا ایک واقعہ ایسا بیان کیا ہے جس سے ان کی سیرت کے اس پہلو کی تصدیق ہوتی ہے ۔

---

۱ ۔ ذکر میر ، صفحہ ٥ ۔ ٦

میر نے لکھا ہے کہ ایک دن وہ پریشانی کے عالم میں گھر آئے اور ماما سے کہا کہ مجھے سخت بھوک لگی ہے ـ جلدی تھوڑی سی روٹی مل جائے تو کچھ سکون نصیب ہو ۔ ماما نے کہا ” اس وقت تو گھر میں کوئی چیز کھانے کی نہیں ہے ۔“ انھوں نے پھر کہا : ”میں بھوک سے بے چین ہوں ۔“ ماما یہ سن کر گھر سے باہر گئی اور بنیے کی دوکان سے آٹا اور گھی وغیرہ لے آئی ، اور روٹی پکانے لگی ۔ اس عرصے میں انھوں نے پھر روٹی طلب کی ۔ ماما اس پر کچھ بگڑ گئی اور کہا کہ ”فقیری اور درویشی کے لیے یہ انداز مناسب نہیں ہے ۔“ یہ سن کر والد صاحب بغیر کچھ کھائے ہوئے یہ کہہ کر گھر سے نکلے کہ ”میں لاہور کے سفر پر جا رہا ہوں ۔ جلدی میں ہوں ۔ ایک درویش سے ملنا ہے ۔“ یہ کہہ کر اپنا رومال جو گریۂ شبی سے بھیگا ہوا تھا ، اٹھا کر چل دیے ۔ ماما ان کے پیچھے دوڑی ، خوشامد کی لیکن انھوں نے ایک نہ سنی ۔ اور لاہور کے سفر پر روانہ ہو گئے ۔ راستے میں جہاں ٹھہرتے غیب سے ان کے کھانے پینے کا انتظام ہو جاتا ۔ لوگ عقیدت کا اظہار کرتے اور نہایت عقیدت اور محبت سے پیش آتے ۔ اس طرح مختلف منزلیں طے کرتے ہوئے وہ چند روز میں لاہور پہنچ گئے ۔

در اصل ان کے لاہور جانے کا مقصد اس مکار اور عیار درویش کو دیکھنا ، اور اس کے طلسم کو توڑنا تھا جو دریائے راوی کے کنارے ایک بارہ دری میں ڈیرہ ڈالے ہوئے تھا ، اور اپنی جھوٹی باتوں سے لوگوں کو گمراہ کر رہا تھا ۔ بہت سے لوگ اس کے جال میں پھنس گئے تھے ، اور اس کے سامنے ناک رگڑتے تھے ۔ میر علی متقی جب اس کے پاس پہنچے تو انھوں نے یہ منظر دیکھا ۔ بنے

ہوئے درویش نے انہیں دیکھ کر کہا کہ "میں تو دین اسلام اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دین کو پھیلا رہا ہوں، لیکن لوگ مجھ پر طرح طرح کے الزام لگاتے ہیں۔" یہ سن کر میر صاحب کے والد کو غصہ آ گیا، کیونکہ انہیں تو اس نام نہاد درویش کی عیاری اور مکاری کا پہلے سے علم تھا۔ کہنے لگے "کمینے! تو جھوٹا اور فریبی ہے۔ ہمارے پیغمبرؐ کا دین تیری تبلیغ و تائید کا محتاج نہیں۔ اگر تو اپنی فریب کاریوں سے باز نہ آیا تو یہ تلوار تیرا خاتمہ کر دے گی۔" یہ کہہ کر وہاں سے چل دیے۔ رات کہیں بسر کی۔ صبح بیدار ہوئے تو وہ نام نہاد فقیر معذرت کے لیے حاضر ہوا۔ لیکن میر صاحب کے والد نے اس سے کہا کہ "معذرت کرنے سے کچھ حاصل نہیں۔ اپنے کرتوتوں سے باز آ، ورنہ ذلیل و رسوا ہوگا"۔ یہ سن کر وہ نام نہاد فقیر شرمندہ ہوا اور وہ کسی حد تک راہ راست پر آ گیا۔

در اصل یہ نام نہاد درویش مغلوں کے دور آخر کی ایک ایسی تحریک سے وابستہ تھا جو اسلام کے لیے خطرہ تھی۔ شاہان وقت تک اس تحریک کے فریب میں آ گئے تھے۔ لیکن جلد ہی اس کا خاتمہ ہو گیا۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میر کے والد میر علی متقی کو بشارت ہوئی کہ لاہور میں ایک نام نہاد درویش اسلام کے پردے میں لوگوں کو فریب دے رہا ہے۔ اس کی سرکوبی کرنی چاہیے، چنانچہ وہ اس اہم کام کے لیے لاہور روانہ ہو گئے، اور اپنے اس مقصد میں انہیں پوری طرح کامیابی ہوئی۔

میر علی متقی اپنے کام کو مکمل کرکے واپس اکبر آباد کے لیے روانہ ہوئے۔ پہلے دلی میں چند روز قیام کیا۔ شہر میں یہ خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی کہ ایک خدا رسیدہ درویش شہر میں آئے ہیں۔ عقیدت مند ملنے کے لیے آئے۔ اس وقت کے بڑے بڑے امراء نے ملنے کی خواہش ظاہر کی لیکن انھوں نے ان امیروں کو کوئی اہمیت نہیں دی، بلکہ بعضوں سے تو ملنے تک سے انکار کر دیا۔ دلی میں ان کا قیام شیخ عبدالعزیز عزت کے بیٹے قمر الدین خاں کے مکان پر تھا۔ یہاں بہت سے لوگ ان کے مرید ہوئے، بہت سے لوگوں کو انھوں نے فیض یاب کیا۔ عقیدت کا یہ عالم تھا کہ لوگ ان کے وضو کا پانی تبرک کے طور پر لے جاتے تھے، اور اس پانی کے استعمال سے بہت سے بیماروں کو شفا ہوئی۔

دلی سے رات کی تاریکی میں تہجد کی نماز پڑھ کر اکبر آباد کی طرف چل دیے۔ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوئی۔ لوگ تلاش کرتے رہے، ان کا کچھ سراغ نہ ملا۔

دو تین دن منزل کرکے میر علی متقی اکبر آباد کے قریب بیانہ پہنچے۔ بیانہ شرفاء کی قدیم بستی تھی۔ یہاں بھی ان کے بے شمار عقیدت مند تھے۔ خبر ملی تو عقیدت کے ساتھ درویش سے ملنے کے لیے آنے لگے۔ منجملہ اور لوگوں کے یہاں ان کی ملاقات ایک سیدزادے سے ہوئی جو نہایت حسین اور خوش شکل تھا درویش پر جذب کی جو کیفیت تھی، اس نے اس نوجوان کو اپنے پاس بلایا اور وہ درویش کو دیکھتے ہی بے ہوش ہو گیا۔ لیکن میر علی متقی نے تھوڑا سا پانی دم کرکے، اور کچھ پڑھ کے اسے پلایا تو وہ ہوش

میں آیا ، اور نہایت عقیدت سے اُس نے یہ عرض کیا کہ میرے گھر تشریف لے چلیے - چنانچہ وہ گئے اور وہاں کچھ کھایا - اتفاق سے اُسی رات اُس نوجوان کی شادی کی تقریب تھی - اس نے شادی میں بھی شرکت کی درخواست کی - اس پر میر علی متقی نے شادی کے بارے میں ان خیالات کا اظہار کیا کہ شادی انسان کو دنیا کا اسیر کر دیتی ہے، اور وہ خدا پرستی کی راہ کا روڑہ بنتی ہے - وہ شادی میں شریک نہیں ہوئے - وہ نوجوان تو برات لے کر دلہن کے گھر گیا اور میر علی متقی اکبر آباد کے لیے روانہ ہو گئے اور ڈیڑھ دن کا سفر طے کرکے اپنے وطن اکبر آباد پہنچے -

شادی کے بعد جب اس نوجوان سید زادے کو درویش کے جانے کی خبر ملی تو وہ بہت پریشان ہوا - دلہن کو چھوڑ کر جنگلوں اور ویرانوں میں نکل گیا ، اور ہر ایک سے اُن کا پتہ پوچھتا رہا - لیکن اس کو ناکامی ہوئی - نتیجہ یہ ہوا کہ پریشان حال پھرتا رہا اور رو رو کر درویش سے ملنے کی دعائیں مانگتا رہا - اچانک اس عالم میں اس نے ایک بزرگ کو دیکھا جنھوں نے اُس کی حالت کو دیکھ کر یہ کہا کہ ”علی متقی اکبر آباد میں ہیں - وہاں جا - تجھے مل جائیں گے -“ اس نے یہ خوش خبری سنی اور فوراً اکبر آباد کو روانہ ہو گیا - جب شہر میں پہنچا تو والد صاحب کو پوچھا - لوگوں نے پتہ بتایا - وہ درویش کے پاس جا کر ان کے قدموں میں گر گیا - میر کے والد نے اس کی طرف توجہ کی ، اور ایک نظر میں اُس کو درویش کامل بنا دیا - اور فرمایا ”امانت اللہ ! تم نے بڑی مصیبتیں اٹھائی ہیں - اب ہم سب تمھارے ہیں - یہ گھر بھی تمھارا ہے - اب تمھیں یہیں رہنا ہوگا -“

اس طرح سید امانت اللہ میر کے خاندان کے ایک فرد ہوگئے ۔
میر علی متقی نے انہیں اپنا بھائی بنا لیا اور انہیں "برادر عزیز"
کہہ کر مخاطب کرنے لگے ۔ اس نسبت سے میر ان کو چچا کہنے
لگے ۔ امان اللہ نے میر کو اپنا بیٹا بنا لیا ، انہیں بقول میر گود
لے لیا اور ان کی تعلیم و تربیت کی پوری ذمہ داری قبول کر لی ۔
میر کی عمر اس وقت سات برس کی تھی ۔ جیسے جیسے وقت گزرتا
گیا میر ان کی شخصیت سے مانوس ہوتے گئے ۔ میر لکھتے ہیں کہ
"میں شب و روز ان کے ساتھ رہتا تھا ۔ بڑی محبت اور لاڈ پیار کے
ساتھ میری پرورش کرتے تھے ۔ میں بھی ان کا گرویدہ ہو گیا تھا ۔
وہ مجھے قرآن مجید پڑھاتے تھے ، اور زندگی کے اسرار و رموز مجھے
سمجھاتے تھے"۔ اس کا اثر میر کی شخصیت پر بہت گہرا ہوا ۔

میر علی متقی کی شخصیت کے اثر سے میر امان اللہ "درویش
کامل" ہو چکے تھے، اور ان کا زیادہ وقت اپنے مرشد کی طرح عبادت
اور ریاضت میں گزرتا تھا ۔ کبھی کبھی بازاروں کی سیر بھی کرتے
تھے اور درویشوں اور فقیروں سے ملتے تھے ۔

ایک دن عجیب واقعہ ہوا ۔ وہ بازار کی سیر کو گئے ۔ وہاں
ایک تاجر کے لڑکے کو دیکھا جو نہایت حسین و جمیل تھا ۔ وہ اس
پر دل و جان سے فریفتہ ہو گئے ۔ اس حد تک کہ حالت خراب ہو
گئی ۔ چلنا مشکل ہو گیا ۔ سہارے کی ضرورت پیش آئی ۔ اس خیال
سے اور بھی پریشان ہوئے کہ اس کی وجہ سے رسوائی ہوگی ۔ لوگ
کیا کہیں گے ۔ مرشد پر کیا گذرے گی ۔ اسی الجھن اور کشمکش
میں ایک شام مغرب کی نماز کے بعد اپنے مرشد کی خدمت میں حاضر
ہوئے۔ انھوں نے دریافت کیا کہ کہاں گئے تھے ۔ انھوں نے اپنا حال زار

بیان کیا ۔ شرمندہ بھی ہوئے ۔ مرشد نے آٹھ دن تک حجرے میں بند رہنے کی ہدایت کی ۔ یہ حکم بجا لائے ۔ ایک ہفتہ اسی طرح گزرا ۔ اس عرصے میں وہ لڑکا پریشان رہنے لگا ۔ لوگوں نے اس کی بدلی ہوئی حالت کو محسوس کیا اور سبب پوچھا ۔ اس نے درویش امان اللہ کا حال بیان کیا ، اور اس واقعے کی تفصیل سنائی جو اس کو پیش آیا تھا ۔ ایک شخص نے یہ سن کر کہا کہ وہ درویش تو مشہور بزرگ میر علی متقی کے چھوٹے بھائی ہیں اور خدا رسیدہ درویش ہیں ۔ نوجوان نے ان کے پاس جانے پر آمادگی ظاہر کی ۔ چنانچہ وہ شخص اس کو میر علی متقی کے پاس لایا ۔ انہوں نے ایک ملازم کے ذریعے میر امان اللہ کو یہ اطلاع دی کہ محبوب انہیں تلاش کر رہا ہے ۔ میر امان اللہ یہ خوش خبری سن کر حجرے سے باہر آئے اور اپنے محبوب سے بغل گیر ہوئے ارر کہا کہ ''میں درویش ہوں ، دل بے مدعا رکھتا ہوں ۔ تیرے عشق میں گرفتار ہوں ۔'' لڑکے نے کہا ''مجھے تو خزانہ مل گیا ہے ، اب میں اسی آستانے کی جاروب کشی کرتا رہوں گا ۔ اور زندگی اسی طرح گزار دوں گا ۔ چنانچہ وہ درویش کی خدمت کرنے لگا ۔ چند روز میں یہ جوان عزیز راہِ طریقت پر اس طرح گامزن ہوا کہ دیکھنے والے اس پر رشک کرنے لگے ۔ درویش کی صحبت نے اس پر اثر کیا اور ان کے فیضِ صحبت نے اسے بھی درویش کامل بنا دیا ۔

میر امان اللہ کو درویشوں سے ملنے کا بہت شوق تھا ۔ ایک دن وہ ایک درویش احسان اللہ سے ملنے گئے جو کسی سے نہیں ملتے تھے ۔ بڑی مشکل سے ان کے پاس پہنچے ۔ احسان اللہ نے کہا کہ ''مجھے محبت کے لائق انسان نہیں ملتے ۔ اس لیے میں سب کو چھوڑ

کر گوشہ نشین ہو گیا ہوں ۔'' تھوڑی دیر دونوں درویش آپس میں
باتیں کرتے رہے ۔

میر بھی اس ملاقات میں اپنے چچا میر امان اللہ کے ساتھ تھے ۔
درویش احسان اللہ نے پوچھا یہ ''بچہ کون ہے'' ؟ میر امان اللہ نے کہا
''یہ میر علی متقی کا بیٹا ہے ، لیکن اب یہ میرا بیٹا ہے ، میں ہی
اس کی پرورش اور دیکھ بھال کر رہا ہوں ۔''

یہ سن کر درویش احسان اللہ نے کہا ''کہ ابھی تو یہ بچہ
ہے لیکن اگر اس کی پرورش صحیح طور پر ہوئی تو آسمان سے بھی
آگے نکل جائے گا ۔ اس سے یہ کہو کہ درویشوں سے ملتا رہے
کیونکہ ان کی صحبت سے بڑا فائدہ ہوتا ہے ۔''

یہ کہہ کر درویش نے ایک روٹی پانی میں بھگو کر میر کو
دی ۔ اس روٹی کے ٹکڑے نے انھیں ایسی لذت دی جو اس سے
پہلے کسی لذیذ کھانے میں بھی انھیں نہیں ملی تھی ۔

اس کے بعد درویش نے زندگی ، کائنات ، نفس ، خدا کی ذات و
صفات ، شریعت اور طریقت کے بارے میں کچھ باتیں کیں ۔ جب
مغرب کا وقت ہوا تو یہ کہہ کر ان دونوں کو رخصت کیا کہ
''یہ خشوع و خضوع کا وقت ہے ۔ اس وقت بیکار بیٹھنا مناسب نہیں ۔
میر علی متقی کو میرا سلام کہہ دینا ۔''

اور یہ کہہ کر درویش اندر چلا گیا اور دروازہ بند کر لیا ۔

میر امان اللہ اور میر وہاں سے رخصت ہو کر میر علی متقی
کے پاس پہنچے ۔ درویش کو سلام کیا ۔ انھوں نے سلام کا جواب دیا

اور کہا کہ "احسان اللہ کی ملاقات کو اللہ تعالی کا احسان سمجھنا چاہیے - میرا سلام بھی ان تک پہنچانا -"

تین چار دن کے بعد میر کے چچا امان اللہ پھر درویش احسان اللہ سے ملنے گئے - پہلے تو انھوں نے حسب عادت انکار کیا لیکن پھر باہر آ گئے اور بہت سی باتیں کیں -

میر نے لکھا ہے کہ ان کی یہ ملاقات بڑی بابرکت تھی - اس سے بہت فائدے ہوئے - ان کے خیالات بڑے ہی قابل قدر تھے - بہت لطف آیا -"

اس ملاقات میں شہر کے حاکم کے مصاحب نصرت یار خاں بھی درویش سے ملنے آئے - بڑی مشکل سے ملاقات ہوئی - درویش نے ان سے کہا کہ "غریبوں کی مدد کرو ، ظلم نہ کرو ، انسان بنو ، نادار اور مظلوم لوگوں کا خیال رکھو - خدا سے ڈرو !"

اور یہ کہہ کر ان کو رخصت کیا -

اسی طرح ایک اور درویش بایزید نامی سے میر کے چچا ملنے گئے - وہ بھی عالم جذب میں تھے - ملاقات ہوئی - بہت سی نصیحتیں انھوں نے بھی کیں اور تصوف اور درویشی کے بہت سے نکتے سمجھائے -

ایک اور درویش اسد اللہ سے بھی میر ، ان کے والد اور چچا کی ملاقات ہوئی - وہ خود ملنے کے لیے آئے - اور پیش گوئیاں کیں جو موت کے بارے میں تھیں - ایک ہفتہ وہ میر کے والد اور چچا کے ساتھ رہے ، اور پھر رخصت ہوئے -

یہ تفصیل اس حقیقت کو واضح کرتی ہے کہ میر کے آبا و

اجداد ، خصوصاً ان کے والد اور چچا درویش خدا مست تھے ، انھیں دنیا سے کوئی خاص سروکار نہیں تھا ۔ وہ یا تو عبادت اور ریاضت میں وقت گزارتے تھے یا درویشوں سے ملتے تھے ۔ زندگی میں ان کا کوئی اور مشغلہ نہیں تھا ۔

میر نے اس ماحول میں آنکھ کھولی اور ان بزرگوں کے سائے میں اپنا بچپن گزارا ۔ چنانچہ درویشی کا یہ رنگ اُن کی شخصیت میں ایسا رچا کہ زندگی بھر اُس نے اُن کا پیچھا نہیں چھوڑا اور وہ مختلف زاویوں سے اپنے آپ کو ان کی رنگا رنگ اور پہلو دار شخصیت میں نمایاں کرتا رہا ۔

تیسرا باب

بچپن اور تعلیم و تربیت

اس خاندانی ماحول میں میر نے آنکھ کھولی - اُن کا سال ولادت ۱۱۳۵ھ ۱۷۲۲ع ہے - بعض لکھنے والوں نے ۱۷۲۳ع ۱۱۳۶ھ اور ۱۷۲۴ع ۱۱۳۷ھ بھی لکھا ہے - لیکن ۱۱۳۵ھ ۱۷۲۲ع ہی زیادہ قرینِ قیاس ہے - میر نے جب ہوش سنبھالا ، اور اپنے آس پاس دیکھا تو انھیں تصوف اور درویشی کا ماحول نظر آیا ، اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے اپنی زندگی کے ابتدائی چند برسوں میں اپنے والد میر علی متقی ہی کے سامنے زانوئے ادب تہہ کیا - میر نے اپنے والد کی نصیحتوں کی جو تفصیل اپنی آپ بیتی میں پیش کی ہے ، اس سے صاف ظاہر ہے کہ انھوں نے اپنے والد ہی سے سب کچھ سیکھا - ہو سکتا ہے کہ فارسی اور اردو کی بعض کتابیں بھی انھیں سے پڑھی ہوں - کیونکہ بعض واقعات سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میر دس بارہ سال کی عمر ہی میں فارسی زبان کی باریکیوں سے اچھی طرح واقف ہو چکے تھے اور غلط محاورے یا الفاظ کے استعمال کو برداشت نہیں کر سکتے تھے - دلی میں صمصام الدولہ امیر الامراء کے سامنے اگرچہ وہ ملازمت کے لیے گئے تھے ، اور انتہائی پریشانی کے عالم میں تھے ، لیکن ان کی زبان سے جب یہ فقرہ نکلا کہ ایں وقت قلم دان نیست ، تو انھیں بے اختیار ہنسی آ گئی کیونکہ یہ محاورہ معیاری فارسی کے اعتبار سے غلط تھا - جب امیر الامراء نے پوچھا کہ ”میاں ! تمھیں ہنسی کیوں آئی ہے“ ؟ تو انھوں نے بے باکی

کے ساتھ کہا کہ ''یہ محاورہ میری سمجھ میں نہیں آیا ۔ اگر یہ کہا جاتا کہ قلم دان بردار حاضر نہیں ہے تو مناسب ہوتا ۔ یا یہ کہا جاتا کہ یہ دستخط کا وقت نہیں ہے ۔ قلم دان تو بے جان چیز ہے ، وقت کو نہیں سمجھ سکتا'' ۔ نواب میر کی ذہانت سے بھرپور باتوں کو سن کر ہنسے اور بجائے ناراض ہونے کے میر سے اتفاق کیا ، اور کاغذات پر دستخط کر دیے ۔ میر نے اپنی سادہ پرکار فارسی میں اس واقعے کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے ۔ یہ بیان نہایت دلچسپ ہے ۔ اس لیے اس کو میر کے الفاظ ہی میں یہاں پیش کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے ۔ لکھتے ہیں :

"خواجہ محمد[3] باسط ، کہ برادر زادۂ صمصام الدولہ امیرالامرا بود عنایتے بہ حال من کرد و پیش نواب برد ۔ چوں مرا دید پرسید کہ ''ایں پسر از کیست ؟" گفت ''از میر محمد علی است" فرمود از آمدن ایں پیداست کہ ایشاں از جہاں رفتہ باشند ۔ پس از افسوس بسیار سخن زد کہ آں مرد بر من حق‌ہا داشت ۔ یک روپیہ روز از سرکار من بہ ایں پسر می دادہ باشند ۔ التماس نمودم اگر نواب لطف می فرمایند دستخط کردہ بدہد کہ جائے سخن متصدیاں نماند ۔ التماسے کہ نوشتہ بودم از کیسہ بر آوردم ۔ ناگاہ از زبان خواجہ مذکور برآمد کہ "وقت قلم دان نیست" ۔ چوں ایں سخن شنیدم بہ قاہ قاہ خندیدم ، نواب در روئے من دید و سبب خندہ پرسید ۔ عرض نمودم کہ ایں عیار ترا نہ فہمیدم ۔ اگر ایشاں می گفتند قلم بردار حاضر نیست ایں حرف گنجائش داشت ، یا آنکہ وقت دستخط نواب نیست بابتی بود وقت قلم دان نیست ، انشائے تازہ است ۔ قلم داں چوبی پیش نمی

باشد ۔ وقت و غیر وقت نمی داند ۔ بہر نفرے کہ اشارت رود
برداشتہ بیارد ۔ نواب بہ خندہ در آمد و گفت کہ معقول می
گوید ۔''[1]

یہ اور اس طرح کے بعض دوسرے واقعات سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ میر بچپن ہی میں فارسی زبان کی باریکیوں سے واقف ہو چکے تھے ۔ ہو سکتا ہے کہ ان کے والد میر علی متقی نے ان باریکیوں سے انہیں آشنا کیا ہو ۔ یا پھر ہو سکتا ہے کہ سراج الدین علی خان آرزو کا فیضِ صحبت ہو ۔

میر نے حیات و کائنات کے اسرار و رموز کے بارے میں اپنے والد کی طویل گفتگو کی جو تفصیلات نظم بند کی ہیں ، ان سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ان موضوعات پر وہ میر کو باقاعدہ درس دیتے تھے ۔ اس لیے یہ خیال غلط نہیں ہے کہ میر کے والد میر علی متقی نے بچپن میں انہیں اکثر درس دیا ، اور اس طرح ایک خاص نقطۂ نظر کو سامنے رکھ کر انہیں علم کی دولت سے مالامال کر دیا ۔ وہ اپنے والد کے درس سے یہ سمجھنے لگے کہ زندگی کیا ہے ؟ دنیا کی کیا حقیقت ہے ؟ انسان کا دنیا میں آنے کا کیا مقصد ہے ؟ اس کو اس زندگی میں کیا کرنا چاہیے ؟ اور اپنا وقت کس طرح گزارنا چاہیے ؟ حیاتِ انسانی کی ناپائیداری ، انسان کی بے ابضاعتی ، اس کی مجبوری اور محرومی کے تمام پہلو اس طرح میر پر روشن ہوگئے ۔ انہوں نے اپنے والد کی عالمانہ باتوں سے خدا کو پہچانا ، اس کی معرفت حاصل کی ، زندگی کی بنیادی حقیقتوں کا ادراک کیا اور اس طرح وہ اعالی و ارفع اخلاق اور روحانی قدروں کے شعور سے مالامال ہوئے ۔

---

۱ ۔ ذکرِ میر ، ص ۹۳

یہ سب کچھ میر علی متقی کا فیض تھا ، جو میر کو نصیب ہوا اور جو ان کی ابتدائی تعلیم و تربیت میں بڑی اہمیت رکھتا ہے ۔ کم از کم اپنی ابتدائی زندگی کے چار پانچ سال یہ سب کچھ حاصل کرنے کے لیے انھوں نے اپنے والد کے قدموں میں گزارے ، اور اس طرح دیکھا جائے تو وہ میر کے معلم اول نظر آتے ہیں ۔

پھر جب میر علی متقی کی روحانی مصروفیات میں وقت کے ساتھ ساتھ اضافہ ہوتا گیا اور وہ عالم جذب کے قریب پہنچ گئے تو انھوں نے میر کو اپنے عزیز تران مرید میر امان اللہ کے سپرد کر دیا ، جنھوں نے میر کو اپنا بیٹا بنا کر ، ان کی تعلیم و تربیت کا سارا بوجھ اپنے کاندھوں پر اٹھا لیا ۔ وہ میر کو ہر وقت اپنے ساتھ رکھتے تھے ، ایک لمحے کو بھی جدا نہیں کرتے تھے ۔ انھیں پڑھاتے تھے ۔ قرآن مجید میر نے انھیں سے پڑھا ۔ انھوں نے اس کا اعتراف واضح الفاظ میں کیا ہے ۔ لکھتے ہیں :

"من دراں ایام ہفت سالہ بودم ۔ با خود مانوس ساخت و در گریبانم انداخت ۔ لمحہ از خود جدایم نمی کرد و بناز و نعم می پرورد ۔ چنانچہ روز و شب با او می ماندم و قرآن شریف بخدمت او می خواندم ۔"[1]

ایک ایسے درویش کے سائے میں پرورش پانا ، اور بچپن کا سارا وقت اس کے سائے میں گزارنا ، اور اس سے قرآن مجید کا درس لینا ، اس حقیقت کو ظاہر کرتا ہے کہ درویش نے دینی معاملات ، اور روحانی تجربات کے اسرار و رموز ، قرآن مجید کا درس دیتے ہوئے ، میر پر

---

۱ ۔ ذکر میر ، ص ٦٩ ۔

ضرور کھولے ہوں گے ۔ میر کی نثری اور شعری تحریروں میں اس بات کے شواہد موجود ہیں کہ انھوں نے اپنے والد میر علی متقی اور چچا میر امانت اللہ کے سامنے زانوئے ادب تہہ کر کے اپنے آپ کو علم کی دولتِ بیش بہا سے مالامال کیا ۔ زندگی کے معاملات اور کائنات کے مسائل کو سمجھا اور زبان و ادب سے بھی رشتہ جوڑا ، جس کی وجہ سے بات کرنے اور الفاظ کی ساحری کو برتنے کے آداب انھیں آئے ۔

میر علی متقی اور میر امان اللہ درویش خدا رسیدہ تو تھے ہی ، لیکن درویشوں سے ملنے اور ان کی صحبتوں میں وقت گزارنے کا بھی انھیں شوق تھا ۔ میر ان ملاقاتوں میں اُن کے ساتھ رہتے تھے ، اور ان درویشوں کی حقیقت پسندانہ گفتگو سنتے تھے ۔ "ذکرِ میر" میں میر نے احسان اللہ ، بایزید اور اسد اللہ کے ایسے درویشوں کی عالمانہ گفتگو کی جو تفصیل پیش کی ہے ، اُس سے یہ نتیجہ آسانی سے نکالا جا سکتا ہے کہ میر کے احساس و شعور پر ان کے اثرات ہوئے ، اور انھوں نے حتی الامکان زندگی میں ان پر عمل بھی کیا ۔

میر کے والد ، جو درویش خدا رسیدہ تھے ، اکثر میر کے سامنے اس طرح کی باتیں کرتے تھے کہ " کھیل کود میں وقت ضائع مت کرو ! زمانہ تیزی سے آگے بڑھتا ہے اور کسی کو فرصت کے چند لمحے بھی نہیں دیتا ۔ اس لیے وقت کو ضائع نہیں کرنا چاہیے ۔ اپنی تعلیم و تربیت سے غافل رہنا مناسب نہیں ۔ زندگی کے راستے پر چلنے کے لیے احتیاط لازمی ہے ۔ اس سفر میں پھونک پھونک کر قدم رکھنا چاہیے ۔ زندگی عشق سے عبارت ہے ۔ اس کے بغیر یہ زندگی وبالِ جان ہے ۔ عشق انسان کو انسان بناتا ہے اور اس پر جلا کرتا

ہے - ساری کائنات عشق سے معمور ہے - ہر شے عشق سے سرشار ہے - دنیا کے اس کارخانے میں عشق کی حکمرانی ہے - اگر عشق نہ ہوتا تو نظم عالم برقرار نہ رہتا - عشق بناتا ہے ، عشق بگاڑتا ہے - دنیا میں جو کچھ بھی ہے وہ عشق کا ظہور ہے - ہوا عشق کا اضطرار ہے ، موت عشق کی مستی ہے ، حیات عشق کی ہشیاری ہے - رات عشق کی نیند ہے ، دن عشق کی بیداری ہے ، مسلمان جمال عشق اور کافر جلال عشق ہے - غرض ہر طرف عشق ہی عشق ہے - اس لیے عشق کو زندگی میں نصب العین بنانا چاہیے -

بے عشق نباید بود، بے عشق نباید زیست
پیغمبر کنعانی عشق بسیرے دارد

ایک اور درویش سے میر نے اس طرح کی باتیں سنیں کہ "اللہ تعالیٰ کی معرفت زندگی کے اس صحرا میں ایک غزالِ وحشی کی حیثیت رکھتی ہے - انسان کا جسم گھوڑا اور روح اس کی سوار ہے - غرور سے دامن بچانا چاہیے - نام و نمود بیکار چیز ہے - دنیا سے ہرگز دل نہیں لگانا چاہیے - کدورت بری چیز ہے - محبت ہی سب کچھ ہے - مادی چیزوں کی ہوس بے سود ہے کیونکہ ہر چیز فنا ہوجانے والی ہے - انسان کے لیے دلسوزی اور غمگینی ضروری ہے - اس کی بدولت ہی وہ زندگی کے حقائق کو سمجھتا ہے - سب سے بڑی حقیقت اپنے آپ کو سمجھنا ، اور ذاتِ الٰہی کو پہچاننا ہے - خدا ہر جگہ موجود ہے ، وہ تو کل کائنات ہے ، نظر ہو تو وہ اپنا جلوہ دکھاتا ہے - اس جلوے کو دیکھنا چاہیے ، اور اس سے لطف اندوز ہونا چاہیے - یادِ الٰہی سب سے اہم کام ہے - اس کے سامنے سجدہ ریز ہونا سب سے بڑی نعمت ہے - گوشہ گیری اور تنہا نشینی اس کے

لیے ضروری ہے ۔ اس میں بڑی عافیت ، بڑی لذت ، اور بڑا ہی لطف و انبساط ہے :

دیدہ ام در عالم صحبت ہائے رنگیں صد کتاب
کردہ ام یک مصرعہ تنہا نشینی انتخاب

مختلف درویشوں کی یہ حقیقت پسندانہ باتیں ، ظاہر ہے کہ زندگی کے بنیادی حقائق کے بارے میں ہیں ، اور ان میں عالمانہ رنگ و آہنگ بھی موجود ہے ۔ میر نے اپنی کم عمری ہی میں یہ باتیں سنیں اور ان کا زیادہ اثر قبول کیا ۔ اس لیے کہ بچپن میں ان خیالات سے اثر قبول کرنے کی صلاحیت نسبتاً زیادہ ہوتی ہے ۔ یہ نقوش ذہن پر اس طرح مرتسم ہوتے ہیں کہ زندگی اور شخصیت کا بنیادی جز بن جاتے ہیں ، اور یہ تعلیم و تربیت کا ایک اہم پہلو ہے ۔

میر کی تربیت اور تعلیم میں ان درویشوں کا بڑا ہاتھ ہے ۔ لیکن ان کے علاوہ بھی میر نے تعلیم و تربیت کے سلسلے میں بعض لوگوں سے استفادہ کیا ہے ـــ اور باقاعدہ تعلیم حاصل کرنے کی کوشش کی ہے ۔

مثلاً "ذکر میر" میں انھوں نے میر جعفر نامی ایک نوجوان سے استفادے کا ذکر کیا ہے ۔ میر لکھتے ہیں کہ میں ایک دن بازار میں کتابوں کی دوکان میں گیا تھا ، اور وہاں ایک کتاب کے جُز لے کر انھیں دیکھ رہا تھا کہ وہاں ایک نوجوان آئے ۔ اس لیے کہ انھیں بھی پڑھنے لکھنے کا شوق تھا ۔ مجھے دیکھ کر کہنے لگے کہ "معلوم ہوتا ہے کہ تمھیں پڑھنے لکھنے کا شوق ہے ، میں بھی کتابوں سے دلچسپی رکھتا ہوں ، اور اپنا بیشتر وقت پڑھنے لکھنے

میں گزارتا ہوں ۔ اگر تمھیں میری ضرورت ہو ، تو میں تمھارے پاس آ جایا کروں گا ۔" میر نے کہا "میرے حالات ایسے ہیں کہ میں آپ کی کوئی خدمت نہیں کر سکتا ، خود نادار ہوں ۔'' کہنے لگے "اگر صرف ناشتہ مل جایا کرے تو میرے لیے کافی ہے" ـــــ میر نے کہا ''حالات سازگار ہو جائیں گے تو اس خدمت کے لیے حاضر ہوں ۔'' انھوں نے کتاب کے جز میرے ہاتھ سے لے لیے اور ترتیب دے کر مجھے دیے ۔ اکثر ان سے ملتا رہا ۔ میرے ساتھ شفقت اور محبت سے پیش آتے رہے ۔ انھوں نے مجھے پڑھایا ، اور بہت کچھ سکھایا ۔ میں نے بھی حتی المقدور ان کی خدمت کی ۔ لیکن وہ کچھ عرصے بعد اپنے وطن عظیم آباد چلے گئے ۔ اس لیے درس و تدریس کا یہ سلسلہ ختم ہوگیا ۔''[۱]

میر کی ان باتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے میر جعفر عظیم آبادی کے سامنے زانوئے ادب تہہ کیا ، اور ان سے پڑھا ، اور بہت کچھ سیکھا ۔

"ذکرِ میر" میں میر نے اپنی تعلیم و تربیت کے سلسلے میں ایک اور صاحب سید سعادت علی کا ذکر بھی کیا ہے ، جو رہنے والے تو امروہہ کے تھے لیکن دلی آکر قلعے میں ملازم ہوگئے تھے ۔ شاعر بھی تھے ، اور اس حیثیت سے اپنے زمانے میں مشہور بھی تھے ۔ معاصر تذکرہ نگاروں نے ان کا ذکر کیا ہے ۔ میر نے صرف اتنا لکھا ہے کہ سید سعادت علی نے انھیں ریختے میں شعر کہنے کی طرف توجہ دلائی ، اور میں نے ان کے کہنے پر عمل کیا ، اور میں بہت جلد مشہور ہوگیا ۔ گلیوں میں میرے اشعار پڑھے جانے لگے ۔ لیکن قرائن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ میر نے ان سے زبان و بیان اور شعر

---

۱ ۔ ذکر میر : صفحہ ٦٦ ۔

و شاعری کے فنی پہلوؤں پر تعلیم حاصل کی ، اور یہ دونوں کچھ عرصے تک استادی شاگردی کے رشتے میں منسلک رہے ۔

میر نے اپنی خود نوشت "ذکرِ میر" میں تو اس وقت کے سب سے بڑے عالم زبان و شعر و ادب سراج الدین علی خان آرزو کا ذکر نہیں کیا ، البتہ اپنے تذکرے "نکات الشعراء" میں انہیں "استاد و پیر و مرشد بندہ" کہا ہے ، جو اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ میر نے خان آرزو سے علمی استفادہ کیا ۔ بعض لکھنے والوں نے جو حساب لگایا ہے اس سے اس بات کا ثبوت بھی ملتا ہے کہ میر تقریباً سات سال خان آرزو کے پاس رہے ، اور ان سے فارسی اور اردو دونوں زبانوں کا علم حاصل کیا ۔ سات سال کی مدت خاصی ہے ۔ اس عرصے میں خان آرزو نے ایک استاد کی حیثیت سے ان کی تعلیم و تربیت کے سلسلے میں نمایاں کام کیا ۔ یہ اور بات ہے کہ بعد میں ان کے تعلقات خان آرزو سے خراب ہوگئے ، اور بقول میر تعلقات کی خرابی کی وجہ سے خان آرزو نے انہیں اتنا پریشان کیا کہ وہ تقریباً مجنوں ہوگئے ۔ تعلقات کی اس خرابی کی وجہ غالباً میر کے سوتیلے بھائی حافظ محمد حسن کا معاندانہ رویہ تھا ، جنھوں نے میر کے ساتھ بچپن ہی سے بیر باندھ رکھا تھا ۔ یہ حافظ محمد حسن ، خان آرزو کے سگے بھانجے تھے ۔ انھوں نے میر کے خلاف آرزو کے کان بھرے جس کا نتیجہ اس اختلاف کی صورت میں ظاہر ہوا ۔

فارسی اور اردو کے بیشتر تذکروں میں خان آرزو کو جگت استاد مانا ہے ، اور اس عہد کے بیشتر شاعروں اور ادیبوں نے ان سے استفادہ کیا ہے ۔ میر کو بھی ان کے شاگرد ہونے کی سعادت نصیب ہوئی ، اور جہاں تک تعلیم و تربیت کا تعلق ہے ، انہیں

خان آرزو سے بہت فائدے پہنچے - میر کی شخصیت میں جو عالمانہ رنگ و آہنگ ملتا ہے ، اور فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں ان کے ہاں جو پختگی اور دلآویزی نظر آتی ہے ، وہ بلاشبہ خانِ آرزو کی خصوصی توجہ کا نتیجہ ہے -

غرض بچپن سے عنفوانِ شباب تک، میر نے کئی اہم شخصیتوں سے تعلیم حاصل کی - حد درجہ ناسازگار حالات میں زندگی بسر کرنے کی وجہ سے اس تعلیم و تربیت میں ایسی کچھ زیادہ باقاعدگی تو پیدا نہ ہو سکی - لیکن تعلیم و تربیت کا یہ سلسلہ بہرصورت جاری رہا - میر علی متقی ، میر امان اللہ ، میرجعفر عظیم آبادی ، سید سعادت علی ، سراج الدین علی خان آرزو اور ''یاران شہر" سے انھوں نے علمی استفادہ کیا - کتابیں پڑھیں ، درس میں شریک ہوئے اور دس پندرہ سال میں اپنے آپ کو اس قابل بنا لیا کہ وہ علمی ، ادبی اور لسانی معاملات و مسائل پر اعتماد کے ساتھ بات کرنے کے قابل ہوگئے ، اور شاعری اور نثر نگاری دونوں اصنافِ ادب میں تخلیقی کام کرنے کی صلاحیتیں ان کے اندر بیدار ہوئیں - ان کے روحانی اساتذہ میر علی متقی ، میر امان اللہ اور مختلف درویشوں کی صحبتوں نے انھیں علم کی ایسی بیش بہا دولت سے مالامال کیا کہ انسان اور حیات و کائنات کے معاملات و مسائل ان کے سامنے آئینہ ہوگئے -

اور اسی صورتِ حال نے انھیں اپنے عہد کا ایک بہت بڑا شاعر ، ایک صاحبِ طرز انشاء پرداز اور زبان و بیان کا ایک منفرد مزاج داں بنا دیا -

★ ★ ★

چوتھا باب

فکر معاش

میر تقریباً بارہ تیرہ سال کی عمر تک اسی ماحول میں رہے ، اور زندگی کی سنگینی سے بے خبر وہ اپنے والد میر علی متقی اور چچا میر امان اللہ کے سائے میں وقت گزارتے رہے ۔ ظاہر ہے کہ یہ درویشی کا ماحول تھا ۔ اس میں آسودگی نام کو بھی نہیں تھی ۔ عسرت اور افلاس کا دور دورہ تھا ۔ قرض پر گذر اوقات تھی ۔ میر نے لکھا ہے کہ اُن کے والد نے انتقال سے چند روز قبل انھیں اپنے پاس بٹھایا ، اور کہا کہ ''وہ تین سو روپے کے ایک بنیے کے مقروض ہیں ۔ ان کا وصال ہو جائے تو یہ رقم کسی نہ کسی طرح ادا کر دینا ، تاکہ عالمِ ارواح میں انھیں پریشانی کا سامنا نہ کرنا پڑے'' ۔ میر کے والد کا اثاثہ صرف تین سو کتابیں تھیں ' جن پر ان کے سوتیلے بھائیوں کی نظر تھی ' اور جو ان کو ہڑپ کرنا چاہتے تھے۔

میر نے اپنے بچپن اور عنفوانِ شباب کا زمانہ ان حالات میں گزارا ۔ اس پر قیامت یہ ٹوٹی کہ اچانک ان کے چچا میر امان اللہ کا انتقال ہو گیا ، اور اس طرح وہ ان کی شفقت ، محبت اور سرپرستی سے محروم ہوگئے۔ اس کا صدمہ میر کے والد کو اتنا ہوا کہ تھوڑے ہی عرصے بعد وہ بھی اس دنیا سے کوچ کر گئے ۔

ادھر ان بزرگوں کی آنکھیں بند ہوئیں اُدھر میر پر قیامتیں ٹوٹیں اور بقول میر ''ساری دنیا اُن کے لیے تاریک ہو گئی ۔ گویا آسمان

اُن پر ٹوٹ پڑا ۔ بہت روئے ، آنسو بہائے ، دیواروں سے سر پھوڑا ، خاک پر لوٹے ، قیامت گذر گئی ۔ پھر سمند ناز پر تازیانہ یہ ہوا کہ بڑے بھائی نے پریشان کرنا شروع کیا ۔ آنکھیں پھیر لیں ۔ باپ بنیے کے مقروض تھے ۔ بڑے بھائی کو یہ خیال ہوا کہ یہ قرض انھیں ادا کرنا ہوگا ۔ اس لیے انھوں نے میر سے یہ کہا کہ "یہ ہماری ذمہ داری نہیں ہے ۔ جس بیٹے کو باپ کا لاڈ پیار ملا تھا ، یہ سب کچھ اس کی ذمہ داری ہے ۔ یعنی میر جو چاہیں کریں"۔ ان باتوں نے میر کے صدمے کو کچھ اور بھی شدید کر دیا ۔ جس بنیے سے میر کے والد نے تین سو روپے اپنی زندگی میں قرض لیے تھے ، وہ ان کے والد کی وفات کی خبر سن کر دو سو روپے لے کر حاضر ہوا ، لیکن میر نے اس رقم کو قبول نہ کیا ۔ جب اس کا علم میر کے چچا سید امان اللہ کے ایک مرید سید مکمل خاں کو ہوا تو انھوں نے اپنے آدمی کے ہاتھ پانچ سو روپے بھیجے اور تعزیت کی ۔ میر نے اس رقم کو قبول کر لیا ۔ تین سو روپے سے تو قرض ادا کیا ، اور بقیہ دو سو روپے والد کی تجہیز و تکفین پر صرف کر کے انھیں اُن کے مرشد کے برابر دفن کر دیا ۔

اب میر بے یار و مددگار ہو گئے ۔ باپ کا سایہ سر سے اُٹھ گیا ۔ چچا پہلے ہی اللہ کو پیارے ہو چکے تھے ۔ کوئی سر پر ہاتھ رکھنے والا باقی نہ رہا ۔ لیکن میر اتنے غیور تھے کہ انھوں نے کسی کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلایا ۔ کسی سے مدد نہیں مانگی اور کسی کا احسان نہیں لیا ۔ بڑے بھائی کی کینہ پروری نے انھیں بہت پریشان کیا ۔ میر کے پاس گزر بسر کے لیے اب کچھ بھی نہیں تھا ۔ اس لیے سوچا اگر وطن ہی میں کوئی کام مل جائے تو زیست کرنے کی

صورت ہو۔

چھوٹے بھائی کی ذمہ داری بھی اب ان پر آن پڑی تھی۔ اس عالم میں کار و بار حیات کا چلانا مشکل تھا۔ اس لیے روزگار کی تلاش میں سارے شہر کی خاک چھانی۔ لیکن روزگار کی کوئی صورت نہ نکلی۔ ناچار معاش کی تلاش میں شہر چھوڑنے پر مجبور ہوئے، اور دلی جا کر روزگار کی تلاش شروع کی۔ عرصے تک پریشان رہے۔ کسی نے شفقت کا ہاتھ سر پر نہ رکھا۔

بالآخر کچھ عرصے بعد اتفاق سے امیر الامرا صمصام الدولہ کے بھتیجے خواجہ محمد باسط سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے حال احوال پوچھا، ہمدردی کا اظہار کیا اور میر کو نواب کے پاس لے گئے۔ نواب نے میر کو دیکھ کر پوچھا "یہ کس کا لڑکا ہے؟" خواجہ باسط نے کہا "میر محمد علی کا جو اب اس دنیا میں نہیں ہیں۔" امیرالامراء نے بہت افسوس کا اظہار کیا اور کہا کہ "میر محمد علی کے مجھ پر حقوق ہیں۔ اس لڑکے کو ایک روپیہ روزانہ سرکار کی طرف سے دیا جائے۔" اس طرح میر ایک روپے روزانہ پر صمصام الدولہ امیر الامرا کے نوکر ہو گئے۔ اس سے میر کو بڑا اطمینان نصیب ہوا۔

لیکن قدرت کی ستم ظریفی دیکھیے کہ کچھ ہی عرصے بعد نادر شاہ نے دلی پر حملہ کیا۔ محمد شاہ بادشاہ وقت سے جنگ ہوئی۔ اس جنگ میں صمصام الدولہ کام آئے۔ نادر شاہ نے دلی کو لوٹا۔ قتل عام کیا اور مغلوں کی سلطنت کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ انتشار اور افراتفری کا دور دورہ ہوا۔ شہر برباد ہو گیا۔ حکومت کی بنیادیں ہل گئیں۔ امراء تک کوڑی کوڑی کو محتاج ہو گئے۔ میر کا

روزینہ بھی بند ہو گیا ، اور انھیں اکبر آباد واپس جانا پڑا ۔ اکبر آباد کی حالت کچھ اور بھی خراب تھی ۔ وہاں میر پر ایک دفعہ پھر عرصۂ حیات تنگ ہو گیا ۔ مارے مارے پھرے لیکن روزگار کی کوئی صورت نہ نکلی ۔ سب نے آنکھیں پھیر لیں ، اور دور دور تک کوئی شفیق اور محبت کرنے والا نظر نہ آیا ۔

اس لیے کچھ عرصے کے بعد مجبوراً ایک دفعہ پھر دلی کے لیے رختِ سفر باندھا ۔ دلی پہنچے اور اب کے اپنے سوتیلے بھائی کے سگے ماموں سراج الدین علی خان آرزو کے ہاں قیام کیا ۔ میر اب جوانی کے حدود میں داخل ہو چکے تھے ۔ اس وقت ان کی عمر سترہ اٹھارہ سال ضرور تھی ۔ گویا عالم شباب تھا ۔ اس عرصے میں میر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جوانی کے اس تجربے سے بھی دو چار ہو چکے تھے جس کو عشق کا نام دیا جاتا ہے ۔ بڑے بھائی کی کینہ پروری نے یہاں بھی پیچھا نہیں چھوڑا ۔ اور اپنے ماموں خان آرزو کو یہ خط لکھا کہ ”میر تقی میر فتنہ روزگار ہے ۔ اس کی تعلیم و تربیت کرنا بے سود ہے ۔ بلکہ بڑے سلیقے سے اس کا کام تمام کرنا ہی مناسب ہے“۔ میر کہتے ہیں کہ اس خط کے بعد خان آرزو نے عداوت پر کمر باندھ لی اور مجھے ہر وقت ڈانٹنا پھٹکارنا شروع کر دیا ۔

میر کی زندگی میں یہ بڑی آزمائش کا وقت تھا ۔ خان آرزو کی دشمنی اور مخالفت نے انھیں کہیں کا نہ رکھا ۔ بیکاری تو پہلے ہی گلے کا ہار تھی ، اب کچھ زیادہ ہی پریشان رہنے لگے ۔ چنانچہ جنون کی کیفیت پیدا ہو گئی ۔ کوٹھری میں بند رہنے لگے ۔ چاندنی راتوں میں یہ جنون کچھ اور بھی بڑھ جاتا ۔ چاند میں انھیں ایک

حسین صورت نظر آتی ۔ ایک پیکر جمیل انھیں اپنی طرف آتا ہوا محسوس ہوتا ، اور اس کو دیکھ کر ان کی بے خودی اور دیوانگی کچھ اور بھی شدت اختیار کر لیتی ۔ وہ چاند کی طرف لپکتے ، دوڑتے بھاگتے ، ہاتھوں میں پتھر رکھتے ، منہ سے جھاگ نکلتے ۔ لوگ ان کی اس کیفیت کو دیکھ کر خوف زدہ ہوتے ۔ چار مہینے تک ان کی یہی کیفیت رہی ۔ نتیجہ یہ ہوا کہ انھیں بند کر دیا گیا اور وہ کچھ عرصے بقول اُن کے ''زنجیری و زندانی'' رہے ۔

بالآخر جب میر کے والد کے مرید فخر الدین خان کی بیوی کو اس سانحے کی خبر ہوئی تو انھوں نے ان کے ساتھ بڑی ہمدردی کی ۔ ان کا علاج کروایا ، اور موسمِ بہار گذرنے کے بعد انھیں افاقہ ہوا ۔ جنون میں کمی واقع ہوئی ، اور انھوں نے معمول کے مطابق پڑھنا لکھنا شروع کر دیا ۔ بیکاری ، عسرت اور افلاس کے عالم میں بھی ان کا یہ مشغلہ جاری رہا ۔ اسی زمانے میں ان کی ملاقات میر جعفر عظیم آبادی اور سید سعادت علی سے ہوئی ۔ جنھوں نے اُن کی تعلیم و تربیت میں نمایاں کردار ادا کیا ۔ میر اردو میں شاعری تو شروع کر ہی چکے تھے ، جلد ہی ان کی شہرت دور دور تک پھیل گئی ۔

میر لکھتے ہیں :

"بعد از چندے با سعادت علی نام سیّدے کہ از امروہہ ، بود برخوردم ۔ آں عزیز مرا تکلیف موزوں کردن ریختہ ، کہ شعر ست بطور شعر فارسی ، بہ زبان اردوئے معلی بادشاہ ہندوستان ، و دراں وقت رواج داشت ، کرد ۔ خود کشی کردم ، و مشق خود بہ مرتبہ رساندم کہ موزونان شہر را مستند شدم ۔ شعر

من در تمام شہر دوید و بہ گوش خرد و بزرگ رسید‘‘[1]

میر کے بیان کے مطابق اس عرصے میں خان آرزو کی مخالفت اور سرزنش کا سلسلہ جاری رہا ۔ ایک دن کھانے پر انھوں نے ڈانٹ ڈپٹ کی ۔ تلخی بڑھی ، میر کی طبیعت بے مزہ ہوئی ، کھانے سے ہاتھ کھینچ لیا اور ان کے گھر سے نکل کر جامع مسجد کی طرف چل دیے ۔ وہاں سے حوض قاضی کی طرف جا رہے تھے کہ وزیر الممالک اعتماد الدولہ کی حویلی کے قریب ایک شخص علیم اللہ نامی انھیں ملا ۔ اس نے پہچان لیا کہ یہ میر تقی میر ہیں ۔ میر نے اس سے کہا کہ ’’تم نے مجھے کیسے پہچانا‘‘ ؟ اس نے جواب دیا ”آپ کے سودائی انداز سے“ ۔ پھر اس نے کہا کہ ’’رعایت خاں جو عظیم اللہ خاں کے بیٹے ہیں ، اور اعتماد الدولہ قمر الدین خاں کے بھانجے ہیں ، آپ کے اشعار کے شیدائی ہیں ۔ جب سے انھوں نے آپ کے شعر سنے ہیں آپ سے ملنے کے مشتاق ہیں ۔ اگر آپ میرے ساتھ چلیں تو مجھے بھی باریابی کا موقع مل جائے گا ۔‘‘

میر نے لکھا ہے کہ ’’میں رعایت خاں کے پاس گیا ۔ بڑی شرافت سے پیش آئے اور مجھے اپنے حلقۂ رفاقت میں داخل کر لیا ۔ یہ ملازمت میرے لیے نعمت غیر مترقبہ ثابت ہوئی ۔ تنگ دستی کا خاتمہ ہوا ، اور بیکاری سے نجات ملی ۔‘‘ یہ ۱۱۶۰ھ/۱۷۴۷ء کی بات ہے ۔

میر خاصے عرصے رعایت خاں کی ملازمت میں رہے ۔ فوجی کارروائیوں تک میں ان کے ساتھ ساتھ پھرے ۔ اسی زمانے میں

---

۱ ۔ ذکر میر : صفحہ ۶۷ ۔

احمد شاہ ابدالی کا حملہ ہوا ، اور وہ کئی سال تک مغلوں کے خلاف نبرد آزما رہا ۔ اسی لڑائی میں قمر الدین خاں کے گولہ لگا اور وہ انتقال کر گئے ۔ اسی زمانے میں محمد شاہ کا بھی انتقال ہو گیا ۔ یہ خبر سن کر صفدر جنگ دلی روانہ ہوئے ۔ رعایت خاں ان کے ساتھ تھے اور میر رعایت خاں کے ساتھ تھے ۔ محمد شاہ کے بعد احمد شاہ تخت پر بیٹھا ۔ اس نے صفدر جنگ کو اپنا وزیر بنایا ، اور وہ بادشاہوں کی طرح ٹھاٹھ سے وقت گذارنے لگا ۔ اسی زمانے میں سادات خاں اور ذوالفقار جنگ بخشی گری کے عہدوں پر فائز کیے گئے ۔ سادات خاں نے راجہ بخت سنگھ کو اس کے بھائی ابھر سنگھ کی سرکوبی کے لیے صوبہ اجمیر کا سربراہ بنا کر راجپوتانہ بھیجا ۔ راجہ بخت سنگھ نے رعایت خاں کو فوج کا سپہ سالار بنایا اور اپنے ساتھ رکھا ۔ میر بھی اس معرکے میں رعایت خاں کے ساتھ رہے ۔ لڑائی ہوئی لیکن بالآخر صلح پر جنگ کا خاتمہ ہوا ۔ اس صلح کے بعد ذرا اطمینان نصیب ہوا تو میر نے اس سفر میں حضرت خواجہ معین الدین چشتی اجمیری کے مزار پر حاضری دی ، اور اجمیر کے مضافات کی سیر سے بھی لطف اندوز ہوئے ۔

میر واپس آئے تو ایک دن رعایت خاں اور بخت سنگھ سے کسی بات پر جھگڑا ہو گیا ۔ لڑائی کی تیاری ہونے لگی ۔ رعایت خاں نے اس صورتِ حال کی نزاکت کو محسوس کیا ، اور معذرت کے لیے میر کو بخت سنگھ کے پاس بھیجا ۔ میر نے اپنی دانش مندی سے آپس میں صلح صفائی کی کوشش کی جس کی وجہ سے اس وقت جنگ کا خطرہ تو ٹل گیا ، لیکن بخت سنگھ کا دل صاف نہ ہوا ۔ چنانچہ اس نے رعایت خاں کو وہاں سے رخصت کیا ، اور وہ دلی آ گئے ۔

میر بھی ان کے ساتھ واپس آئے، اور کچھ عرصے اپنے گھر میں بیٹھے رہے -

اسی زمانے میں میر اپنی بے دماغی کی وجہ سے رعایت خاں سے ناراض ہو گئے - اس کا سبب یہ ہوا کہ چاندنی رات تھی، ایک لڑکا رعایت خاں کے سامنے گا رہا تھا - خاں نے میر کو دیکھا تو کہا کہ ''آپ اپنے چند شعر اس لڑکے کو یاد کرا دیجیے تاکہ یہ گائے'' میر کو یہ بات ناگوار گذری - لیکن چونکہ ملازم تھے، اس لیے طوعاً و کرہاً پانچ شعر ریختہ کے اس لڑکے کو یاد کرائے لیکن یہ بات میر کو اچھی نہیں لگی، اور انھوں نے اس کے بعد رعایت خاں کے پاس آنا جانا چھوڑ دیا - اس طرح میر کی یہ ملازمت ختم ہوگئی - لیکن رعایت خاں بامروت اور سمجھ دار آدمی تھا - میر کے مزاج کو سمجھتا تھا - ان کی نازک مزاجی سے آشنا تھا - اس لیے اس نے میر کے چھوٹے بھائی محمد رضی کو ملازم رکھ لیا تاکہ میر کو تکلیف نہ ہو اور گذر بسر ہوتی رہے - کچھ عرصے بعد جب میر کی رعایت خاں سے ملاقات ہوئی تو اس نے چاند رات کے واقعے پر معذرت کی۔

میر اس کے بعد نواب بہادر جاوید خاں کے ہاں ملازم ہوگئے - فوج کے بخشی اسد یار خاں نے ان کی مدد کی - جاوید خاں میر کا بہت خیال رکھتا تھا، اور ہر طرح ان کی مدد کرتا تھا - اس ملازمت سے میر کا تھوڑا سا اچھا وقت گذر گیا - لیکن زندگی میں نشیب و فراز آتے رہے - کبھی ملازمت کرتے تھے، کبھی خانہ نشین ہو جاتے تھے اور مطالعے میں اپنا وقت صرف کرتے تھے -

جب نواب بہادر جاوید خاں کو صفدر جنگ نے ایک دعوت

میں بلا کر قتل کروا دیا تو میر ایک دفعہ پھر بیکار ہوگئے۔ جب وزیر کے دیوان مہا نرائن کو اس کا علم ہوا تو انھوں نے دیوان خانے کے داراوغہ میر نجم الدین سلام کے ہاتھ پیغام بھیجا اور میر کو بلایا اور ان کی دل جوئی کی ۔ بہت کچھ دیا اور اس طرح میر کا وقت پھر اچھی طرح گذرنے لگا ۔ لیکن یہ سلسلہ بھی زیادہ عرصے تک جاری نہ رہ سکا ۔ پھر ناسازگار حالات پیدا ہوئے ۔ میر نے اس زمانے میں خان آرزو سے علیحدگی اختیار کر لی اور اُن کو چھوڑ کر امیر خاں کی حویلی میں رہنے لگے ۔

میر کی حالت اس زمانے میں اچھی نہیں تھی ۔ راجہ جگل کشور نے ، جو محمد شاہ کے زمانے کے ایک اہم امیر تھے ، اپنے اشعار پر میر سے اصلاح لینی چاہی لیکن ان کے اشعار میر کو پسند نہیں آئے ۔ اس لیے انھوں نے اس خدمت کو قبول نہیں کیا ۔ چنانچہ ملازمت کا یہ سلسلہ بھی ختم ہوا ۔ اور دن ایک دفعہ پھر پریشانی میں گذرنے لگے ۔

ایک دن میر نے راجہ جگل کشور سے اپنی پریشانی کا حال بیان کیا ۔ اس نے افسوس کا اظہار کیا اور میر کی مدد کی ۔ راجا کے بڑے لڑکے نے بھی میر کا خیال کیا اور سال بھر کی تنخواہ یک مشت ادا کر دی ۔ اس طرح میر کا حال پھر کچھ بہتر ہوا ، اور وقت کسی قدر سکون اور اطمینان سے گذرنے لگا ۔ دلی کی حالت اس زمانے میں بہت خراب تھی ۔ ابدالی کے حملوں نے شہر کو تباہ و برباد کر دیا تھا ۔ مرہٹوں کی یورشوں نے بھی سکون ناپید کر دیا تھا ۔ عوام پریشان حال تھے ۔ عسرت اور پریشانی کا دور دورہ تھا ۔ میر اس صورت حال سے پریشان ہو کر دلی سے نکلے ۔ اپنے خاندان کے ساتھ پیدل چل دیے ۔ آٹھ نو کوس چل کر ایک درخت کے نیچے

ٹھہرے ۔ اتفاق ایسا ہوا کہ آدھر سے راجہ جگل کشور کی بیوہ گذریں ۔ انھوں نے میر کو دیکھا ، حال احوال پوچھا ۔ مدد کی اور اپنے ساتھ برسانہ لے گئیں جہاں میر کو اچھی طرح رکھا اور ان کی ہر طرح مدد کی ۔ وہ اپنے ساتھ میر کو کامان بھی لے گئیں ۔ یہاں سے میر کمھیر پہنچے ۔ یہاں صفدر جنگ کے خزانچی کے بیٹے بہادر سنگھ نے میر کی مدد کی ۔ انہیں اپنے ساتھ لے گیا ۔ میر کا بہت خیال رکھا ، اور ان کا وقت پھر کسی قدر سکون اور اطمینان سے گزرنے لگا ۔

کمھیر میں میر کی ملاقات راجہ ناگر مل سے ہوئی ۔ میر کو آن کے آنے کی خبر ملی تو وہ سورج مل کے قلعے میں ان سے ملنے گئے ۔ میر نے ان کے سامنے اپنا حال زار بیان کیا ۔ راجہ نے حوصلہ افزائی کی ۔ خرچ کے لیے بہت کچھ دیا ، اور وظیفہ جاری رکھنے کی ہدایت کی ۔

غرض اس طرح میر دلی اور اس کے مضافات میں مختلف آمراء و رؤسا کے ساتھ اپنا وقت گذارتے رہے ۔ کبھی معاش کی کوئی صورت نکلتی ، کبھی زمانے کی نا سازگار حالت آن کا حال خراب کر دیتی ۔ اس زمانے میں سکون ناپید تھا ۔ میر صاحب کو سکون کس طرح ملتا ؟ بیرونی یورشوں اور داخلی خلفشار نے زندگی کو عذاب بنا دیا تھا ۔ بار بار خون کی بارش ہوتی تھی ، قتل عام ہوتا تھا ۔ لوٹ کھسوٹ کا بازار گرم ہوتا تھا ۔ حکومت کمزور ہو چکی تھی ، بلکہ برائے نام رہ گئی تھی ، خزانے خالی ہو گئے تھے ۔ ہر شخص عسرت اور افلاس کا شکار تھا ۔ میر بھی زندگی بھر اس کا شکار رہے ۔ لیکن انھوں نے زیست کرنے اور زندہ رہنے کے لیے ہر حال میں جد و جہد جاری رکھی ۔ بالآخر ایک وقت ایسا آیا کہ انھوں نے ناسازگار حالات کے سامنے

سپر ڈال دی ، اور دلی کو چھوڑ کر لکھنؤ جانے کا فیصلہ کر لیا ۔ اودھ کے نواب آصف الدولہ کی یہ خواہش تھی کہ میر ان کے پاس لکھنؤ آئیں ۔ چنانچہ انھوں نے زاد راہ بھیج کر بلایا ، اور اپنے ملازموں کی صف میں داخل کر لیا ۔ خاصی تنخواہ مقرر کی ، اور اس طرح لکھنؤ میں میر کا وقت اچھا گزرنے لگا ۔ لیکن وطن کی یاد انھیں ہمیشہ ستاتی رہی اور اس یاد نے انھیں ایک لمحے کے لیے بھی چین سے نہیں بیٹھنے دیا ۔

یہ تفصیل اس حقیقت کو واضح کرتی ہے کہ میر زندگی بھر فکرِ معاش میں سرگرداں رہے ۔ بری بھلی معاش کی صورتیں نکلیں بھی لیکن روزگار کے معاملے میں جس کو آسودگی اور یک سوئی کہتے ہیں ، وہ میر کو کبھی بھی نصیب نہ ہوئی ۔ جیسے یہ آسودگی اُن کی قسمت ہی میں نہیں تھی ۔ اس سلسلے میں تو انھیں زمانے کے گرم و سرد کو دیکھنا پڑا ، اور ایسے ایسے تلخ تجربات ہوئے جو دلوں کو ہلاتے ہیں ، اور جن کی تفصیل سن کر کلیجہ منہ کو آتا ہے ۔

پانچواں باب

عشق و عاشقی

میر اپنی زندگی میں غمِ روزگار کے ساتھ ساتھ غمِ عشق سے بھی دوچار ہوئے۔ سنِ شعور کو پہنچنے سے کچھ پہلے ہی انھوں نے اس کوچے میں قدم رکھا، اور ''فتنۂ روزگار'' کہلائے۔ اس کی تفصیل تو درکنار، میر نے تو اس واقعے کا کہیں ذکر تک نہیں کیا ہے۔ شاید اس کی وجہ رسوائی کا ڈر اور بدنامی کا خیال تھا۔ البتہ ان کی شاعری میں واضح طور پر عشق و عاشقی کے کوچوں کی خاک چھاننے کا اعتراف موجود ہے۔ قاعدے کی بات تو یہ تھی کہ میر ''ذکرِ میر'' میں اس کا ذکر کرتے، لیکن وہ صاف دامن بچا کر گزر گئے۔ اس لیے کہ شاید معاشرے کی پابندیوں کی وجہ سے اُن کے اندر اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہ اس واقعے کی تفصیل بیان کرتے۔ حالانکہ کسی اور ضمن میں انھوں نے اس کی طرف اشارہ کیا ہے کہ وہ حسینوں کے شیدائی تھے۔ ان کو دیکھ کر لطف اندوز ہوتے تھے۔ ''ذکرِ میر'' میں اپنے محلے اور گھر کی تباہی و بربادی کا ذکر کرتے ہوئے انھوں نے ضمناً اس حقیقت کا اعتراف کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

''ناگاہ در محلہ رسیدم کہ آنجا می ماندم۔ صحبت می داشتم۔ شعر می خواندم۔ عاشقانہ می زیستم، شب ہا می گریستم۔ عشق با خوش قداں می باختم۔ ایشاں را بلند می انداختم۔ با سلسلہ مویاں می بودم۔ پرستش نکویاں می نمودم۔ اگر دمے

بے ایشاں می نشستم ، تمنا بر تمنا می شکستم ۔ بزم می آراستم ، خوباں را می خواستم ، مہمانی می کردم ، زندگانی می کردم ۔"[1]

اس عبارت میں عاشقانہ زیست کرنے ، عشقِ خوش قداں سے لطف اندوز ہونے اور خوباں کی خواہش کرنے کا ذکر واضح طور پر موجود ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ میر کا مزاج لڑکپن ہی سے عاشقانہ تھا ۔ یہ اور بات ہے کہ زمانے نے انھیں اتنی فرصت نہیں دی کہ وہ اس کوچے میں ہنگامہ آرائیاں کرتے ۔ بات شاید یہ ہے کہ ان کی جوانی دیوانی نہیں تھی ۔ اس لیے انھوں نے اس کوچے میں قدم تو رکھا لیکن نہایت سلیقے اور احتیاط کے ساتھ اس سے عہدہ برآ ہوئے ۔ غالباً اسی سلیقے ارر احتیاط ہی کا یہ نتیجہ تھا کہ انھیں ان معاملات میں ہمیشہ ناکامیوں کا منہ دیکھنا پڑا ۔

مرے سلیقے سے میری نبھی محبت میں
تمام عمر میں ناکامیوں سے کام رہا

زمانے اور ماحول نے میر کے عشق کا گلا گھونٹ دیا ، اور اس کو فطری طور پر پھلنے پھولنے اور اس کو شگفتہ و شاداب رہنے سے باز رکھا ۔ وہ تو بِن کھلے ہی مرجھا کر رہ گیا ۔ اسی لیے ان کی زندگی میں حسرت اور ناکامی کی ایک لہر سی دوڑی ہوئی نظر آتی ہے ۔

میر نے جن حالات میں اپنا بچپن گذارا ، اور اس ماحول میں جو باتیں آن کے کانوں میں پڑیں ، ان کے پیشِ نظر میر کا عملی طور پر عشق کے کوچے میں قدم رکھنا ناگزیر تھا ۔ آن کے والد

---

۱ - ذکرِ میر ، ص ۸۶ -

ہر وقت اس قسم کی باتیں کرتے تھے کہ ''عشق کرو ، اس لیے کہ زندگی کا کارخانہ عشق ہی سے چلتا ہے ۔ اگر عشق نہ ہوتا تو دنیا میں نظم و ضبط قائم نہ رہتا ۔ نظامِ عالم قائم ہی عشق کے دم سے ہے ۔ عشق کے بغیر زندگی بیکار ، بےسود بلکہ وبالِ جان ہے ۔ عشق میں جان کی بازی لگا دینا ہی انسانی زندگی کی معراج ہے ۔ میر کے الفاظ کتنے خوبصورت ہیں :

''اے پسر ! عشق بورز ۔ عشق است کہ دریں کارخانہ متصرف است ۔ اگر عشق نمی بود نظمِ دل صورت نمی بست ۔ بےعشق زندگانی وبال است ۔ در باختۂ عشق بودن کمال است ، عشق بسازد ، عشق بسوزد ۔ آب رفتار عشق است ، خاک قرار عشق است ، باد اضطرار عشق است ، شب خواب عشق است ، روز بیداری عشق است ، مسلم جمال عشق است ، کافر جلال عشق است ۔ صلاح قرب عشق است ، گناہ بعد عشق است ، بہشت شوق عشق است ۔ دوزخ ذوق عشق است ۔ مقام عشق از عبودیت و عارفیت و زاہدیت و صدیقیت و خلوصیت و مشتاقیت و خلیت و حبیبیت برتر است ۔ جمع برآنند کہ حرکت آسمان ہا حرکتِ عشقی است ، یعنی بہ مطلوب نمی رسند و سرگردانند :

بےعشق نباید بود بے عشق نباید زیست
پیغمبر کنعانی عشق پسرے دارد[1]

جس شخص کے کانوں میں ہوش سنبھالتے ہی عشق و عاشقی کے بارے میں اس قسم کی باتیں پڑیں تو ناممکن ہے کہ اس پر ان باتوں

---

۱ - ذکرِ میر ، ص ۵ - ٦

کا اثر نہ ہو ، اور ناممکن ہے کہ وہ ان باتوں کو سن کر کسی پیکرِ انسانی میں ان خصوصیات کو نہ دیکھنے لگے ۔ اس عمر میں انسان کے لیے حسن کی خصوصیات کو کسی نسوانی پیکر میں دیکھنا ، اور اس پر فریفتہ ہونا فطری بات ہے ۔

میر بھی عالمِ طفلی اور عنفوانِ شباب ہی میں اس تجربے سے دوچار ہوئے ۔ اس کی کچھ تفصیل منشی احمد حسین کے تذکرے "تذکرۂ بہار بے خزاں" میں ملتی ہے ۔ لکھتے ہیں :

"مشہور است کہ بہ شہر خویش باپری تمثالے ، کہ از عزیزانش بود ، در پردہ تعشق طبع و میل خاطر داشت ۔ آخر عشق او خاصیت مشک پیدا کردہ ۔ می خواست کہ بخیہ بہ چار سوئے رسوائی بہ کند ، و حسن بے پردہ بہ جلوہ گری در آید ۔ از ننگ افشائے راز و طعن اقربا ہاوے در لغل پروردہ حسرت و با خاطر ناشاد دست و گریباں قطع رشتۂ حب وطن ساختہ ۔ از اکبر آباد بعد از خانہ براندازیہا بہ شہر لکھنؤ رسید و سنگ شکیبائی بر سینہ زد ۔ از آوارہ گردی ہا آرمید و ہمیں جا بہ صد حسرت جانکاہ ، جلاوطنی و حرماں نصیبی از دیدار یار جاں بہ جہاں آفریں داد ۔ تابقید رشتۂ حیات بود طوق محبت بہ گردن و سلسلۂ دیوانگی بپاداشت ۔ از کلام عاشقانہ درد انگیزش پیداست کہ صد آرزو بخاک برد ۔"[1]

غرض یہ کہ میر کو بچپن ہی میں عشق و عاشقی کا یہ تجربہ ہوا ، اور ساری زندگی وہ اس حصار سے باہر نہ نکل سکے ۔ زندگی

---

۱ ۔ تذکرۂ بہار بے خزاں (قلمی)

پھر آن پر اس کے اثرات مختلف صورتوں میں مختلف زاویوں سے اپنے آپ کو رونما کرتے رہے - ان کا کلام ان اثرات کا صحیح آئینہ ہے ، اور ان کی زندگی کے اس پہلو کے تمام خد و خال اس آئینے میں پوری طرح بے نقاب نظر آتے ہیں -

میر کی غزلیں تو ان عشقیہ تجربات کی تفصیل و جزئیات کو پیش کرتی ہی ہیں لیکن ان میں حقائق رمز و ایما کے پردوں میں چھپے ہوئے ہیں - البتہ میر کی مثنویوں میں ان تجربات کی تفصیل کچھ اس طرح ملتی ہے کہ ان کی زندگی کے اس پہلو سے متعلق پڑھنے والے کو ایک اچھا خاصا خزانہ ہاتھ آ جاتا ہے -

اس سلسلے میں ان کی سب سے اہم مثنوی ''معاملاتِ عشق'' ہے - میر نے اس میں بڑے بھرپور انداز میں اپنے عشقیہ تجربات کی تفصیلات کو پیش کیا ہے - اس مثنوی میں میر نے اپنے عشق کے آٹھ معاملے بیان کیے ہیں - پہلے عشق اور اس کے مختلف روپ دکھائے ہیں اور پھر کاروبارِ شوق کی تفصیل 'معاملات' کی صورت میں بیان کی ہے - ان میں کہیں سراپا کا بیان ہے ، کہیں اختلاط اور راز و نیاز کی باتیں ہیں ، کہیں وصلِ محبوب کی سحرکاری کا ذکر ہے ، اور کہیں عاشق نامراد کی تنہائیوں اور ہجر و فراق ، اور حزن و یاس کی تباہ کاریوں کی تصویر کشی ہے ، اور ان تمام پہلوؤں نے مل کر میر کی عشق و عاشقی کے رنگا رنگ اور گوناں گوں تجربات کا پورا نقشہ آنکھوں کے سامنے پیش کر دیا ہے -

مثنوی کا آغاز جذبۂ عشق کے مختلف تصورات کے بیان سے ہوتا ہے - ان تصورات میں انہیں خیالات اور احساسات کی گونج

سنائی دیتی ہے جو عالمِ طفلی میں میرؔ کے کانوں میں بار بار ڈالے گئے تھے - مثلاً یہ چند اشعار دیکھیے :

کچھ حقیقت نہ پوچھو کیا ہے عشق
حق اگر سمجھو تو خدا ہے عشق
عشق ہی عشق ہے نہیں ہے کچھ
عشق بن تم کہو کہیں ہے کچھ
عشق تھا جو رسول ہو آیا
اُن نے پیغامِ عشق پہنچایا
عشق حق ہے کہیں نبی ہے عشق
ہے محمد کہیں علی ہے عشق
عشق عالی جناب رکھتا ہے
جبرئیل و کتاب رکھتا ہے

آگے چل کر اپنے عشق کا حال اور اس میں ناکامی، مجبوری اور محرومی کی کیفیت کو اس طرح بیان کرتے ہیں :

خستۂ عشق کچھ نہ میر ہوئے
بادشاہ عشق میں فقیر ہوئے
کوئی دل تنگ ہو کنوئیں میں گرا
کوئی ڈوبا کوئی گیا نہ پھرا
جب پتنگا ہوا تھا اس کے داغ
تب دیا جی کو اُن نے پیش چراغ
عشق کی فاختہ ستم کش ہے
عشق سے عندلیب دلکش ہے
عشق باعث ہوا وطن چھوٹے
مرغ پکڑے گئے چمن چھوٹے

مایۂ درد و رنج سب ہے عشق
متصل رونے کا سبب ہے عشق
پڑ گئے دل جگر میں آخر چھید
کچھ نہ پایا کنھوں نے عشق کا بھید
اپنی تیغ ستم جو اینچے عشق
جاسے بہتوں کے خوں میں کھینچے عشق

اور میر نے آگے چل کر کہا ہے کہ :

اس بلا سے مجھے بھی کام ہوا
عاشقِ زار میرا نام ہوا
قصہ میرا بھی سانحہ ہے عجب
کس پہ گذرا ہے یہ ستم یہ غضب

معاملۂ اول میں میر نے لکھا ہے کہ ایک صاحب سے میرا دل لگا ۔ میں ان کے نام ہی پر عاشق ہوگیا ۔ لوگ ان کی خوبیاں بیان کرتے تو میں کان لگا کر سنا کرتا ۔ پھر ایک دن وہ ملے ۔ ان کے دیکھنے کا انداز دل میں کھب گیا ۔ میں ان کا منہ دیکھتا رہتا ، اور کچھ نہ کہتا ۔ وہ کسی اور کے تصرف میں تھے ، اور رسوائی کے خیال سے بہت ڈرتے تھے ۔ اس لیے مجھ سے ملنے میں بہت احتیاط برتتے تھے ۔ لیکن بالآخر عشق نے آن پر بھی اپنا جادو کیا ، اور آن کی چتون سے بھی پیار ٹپکنے لگا ۔ میری باتوں کے انداز کو پسند کرنے لگے ۔ لیکن اندازِ محبوبانہ سے عشوہ ہائے ترکانہ دکھانے لگے ۔ ویسے میرا خیال رکھتے ۔ میری آزردگی کو پسند نہ کرتے ۔ لیکن کبھی رشک کی آگ میں ضرور جلتے ۔ آپس میں ملنے اور رونے دھونے کا سلسلہ بھی جاری رہتا ۔

ایک مدت تک یہ صحبت رہی ۔ رفتہ رفتہ وہ رام ہونے لگے ، اور اختلاط کے مواقع فراہم کرنے لگے ۔ شرارتیں بھی کرتے ۔ میرے سینے پر پاؤں رکھ دیتے ، اور مجھ سے اپنے پاؤں کو ہاتھ لگواتے ۔ ان کے حسن و جمال کی تفصیل کیا بیان کروں :

کیا کہوں ؟ کیسا قد بالا ہے
قالب آرزو میں ڈھالا ہے
ایک جاگہ سے ایک جاگہ خوب
پیکر ناز اس کے سب محبوب
موئے سر ایسے جی بھی کریے ناز
بل ہی کھایا کرے یہ عمر دراز
اس کی زلفوں کے دل گئے ، نہ پھرے
رہے سنبل کے پیچ پاچ دھرے
کیا چمکتا ہے ہائے رنگ قبول
جیسے مکھڑا گلاب کا سا پھول
برگ گل سے زبان ہے نازک تر
پھول جھڑتے ہیں بات بات اوپر
کیا کہوں کم ہیں ایسے شیریں گو
وہ زبان کاش میرے منہ میں ہو

میر کہتے ہیں کہ ایک دن اس بت ہزار شیوہ نے میرا ہاتھ فرش پر رکھ کر اپنے پاؤں سے میری انگلی دبا دی ، اور اس سے بجائے چوٹ لگنے کے مجھے وہ لطف و سرور حاصل ہوا جس کی لذت بیان سے باہر ہے ۔ ایک دن وہ پان چبا رہے تھے ، میں ان کے سرخ لبوں کو دیکھ کر لطف اندوز ہو رہا تھا ۔ میں نے کہا اس کا

آگاں مجھے بھی عنایت ہو - پہلے تو انھوں نے ٹال دیا لیکن بالآخر میری خواہش پوری کر دی - اس لطف و کرم کو میں کبھی بھول نہیں سکتا - ایک دفعہ مجھ سے ایک منقبت لکھوایا - بہت خوش ہوئے اور میری خواہشوں کو پورا کرنے لگے - کبھی بستر پر میرے سامنے لیٹتے اور اٹکھیلیاں کرتے - لیکن خدا جانے پھر کیا ہوا کہ وہ مجھ سے کھنچے کھنچے رہنے لگے ، اور انھوں نے رشتۂ ربط توڑ دیا - پھر کچھ عرصے بعد ملنے جُلنے کا سلسلہ جاری ہوا - لیکن پھر وہی جدائی میری قسمت میں لکھی تھی - وہ خود برے نہیں تھے - میرے طالعوں ہی کی ناراسائی تھی - انھوں نے مجھ سے کہا کچھ عرصے جدائی کا زہر ہمیں پینا ہوگا - چنانچہ ہجر و فراق مستقل طور پر میرا مقدر بن گیا -

اور میر زندگی بھر ہجر و فراق کے یہ صدمے سہتے رہے ، اور اپنی اس محبت کے کرب کو سینے سے لگائے پھرتے رہے - ایک لمحے کو بھی انھیں زندگی میں سکون نصیب نہ ہوا -

اس عشق و عاشقی کے کاروبار میں میر نے اتنی تکلیفیں اٹھائیں اور بعض لوگوں نے انھیں اتنا پریشان کیا کہ وہ جنون کی سرحدوں میں داخل ہوگئے - یہ وہ زمانہ تھا جب میر خانِ آرزو کے ہاں قیام پذیر تھے - میر کہتے ہیں کہ انھوں نے کسی کے کہنے سے ان پر اتنا ظلم کیا کہ وہ دیوانے ہوگئے - اس حد تک کہ انھیں ''زنجیری اور زندانی'' بنا دیا گیا - اس جنون کے عالم میں انھیں چاند میں محبوب کی تصویر نظر آتی تھی اور وہ اس کی طرف دوڑتے تھے - کچھ عرصے بعد علاج سے کچھ ٹھیک ہوئے - مثنوی ''خواب و خیال''

میں اس کی تفصیل موجود ہے۔ صرف چند اشعار اس کیفیت کا اندازہ لگانے کے لیے کافی ہیں :

مجھے یہ زمانہ جدھر لے گیا
غریبانہ چندے بسر لے گیا
بندھا اس طرح آہ بار سفر
کہ نے زادرہ کچھ نہ بار سفر
دل اک یار سو بے قرار بتاں
غبار سر رہگذار بتاں
گرفتار رنج و مصیبت رہا
غریب دیار محبت رہا
چلا اکبر آباد سے جس گھڑی
در و بام پر چشم حسرت پڑی
کہ ترک وطن پہلے کیونکر کروں
مگر ہر قدم دل کو پتھر کروں
دل مضطرب اشک حسرت ہوا
جگر رخصتانے میں رخصت ہوا
کھنچا ساری رہ دامن چاک دل
رہا ہر قفا روئے غم ناک دل
پس از قطع رہ لائے دلی میں بخت
بہت کھینچے یاں میں نے آزار سخت
جگر جور گردوں سے خوں ہوگیا
مجھے رکتے رکتے جنوں ہوگیا

نظر آئی اک شکل مہتاب میں
کمی آئی جس سے خور و خواب میں
اگر چند پرتو سے اس کے ڈروں
ولیکن نظر اس طرف ہی کروں
اسے دیکھوں جیدھر کروں میں نگہ
وہی ایک صورت ہزاروں جگہ
نگہ گردشِ چشم سے فتنہ ساز
مژہ آفتِ روزگارِ دراز
سراپا میں جس جا نظر کیجیے
وہیں عمر اپنی بسر کیجیے

وہ صورت کا وہم اور دیوانگی
لگی کرنے درپردہ بیگانگی
پس از دیر آنکھوں میں آنے لگی
نہ دو دو پہر منہ لگانے لگی
نہ دیکھے مری اور اس پیار سے
غریبانہ سر مارے دیوار سے

خیال اس کا آوے کہ سن ہور ہوں
تلے سر کے ہتھر رکھوں سو رہوں
مجھے آپ کو یوں ہی کھوتے گئی
جوانی تمام اپنی سوتے گئی
دکھایا نہ اس مہ نے رو خواب میں
نہ دیکھا پھراس کو کبھو خواب میں

بہت بے خود و بے خبر ہو چکا
ہم آغوش ِ طالع بہت سو چکا
نہ دیکھا کبھو میر پھر وہ جمال
وہ صحبت تھی گویا کہ خواب و خیال

یہ میر کی عشق و عاشقی کی روداد غم ہے ، جس کے ان گنت تجربات انھیں عالم جذب و جنوں میں ہوتے ـ

میر اس جذب و جنوں کی کیفیت کو تو جھیل گئے ، اور اس کے حصار کو توڑ کر باہر تو نکل آئے لیکن عشق کی ناکامی نے جو غم انھیں دیا ، وہ ساری زندگی ، ان کے دم کے ساتھ رہا ـ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ یہ غم تو ان کی زندگی اور شخصیت کا لازمی جز بن گیا اور وہ اسی غم سے پہچانے جانے لگے ـ اس غم کا عرفان بھی ان کی زندگی اور شخصیت کی ایک اہم خصوصیت ہے ـ یہی وجہ ہے کہ زندگی کے ان گنت نشیب و فراز میں عشق و عاشقی کی ناکامی کے نتیجے میں پیدا ہونے والا یہ غم اور اس کا عرفان ، ان کے ہاں ہر جگہ اپنی جھلک دکھاتا ہے ـ میر اس کو عزیز رکھتے ہیں ، اور اس کو اپنے سینے سے لگائے زندگی کے سفر میں رواں دواں نظر آتے ہیں ـ یہ غم ِ عشق ان کے لیے جینے کا سامان ہے ، زیست کرنے اور اپنے آپ کو زندہ رکھنے کا ایک وسیلہ ہے ، اور غم ِ روزگار سے نبرد آزما ہونے کا ایک ہتھیار ہے ـ

افسوس ہے کہ میر کی اس عشق و عاشقی کے واقعات اور حالات کی تفصیل ہمیں کہیں نہیں ملتی ـ کاش میر اس کے بارے میں اپنی خود نوشت میں کچھ تفصیل سے لکھتے ! انھوں نے ایسا نہیں کیا اور آئندہ نسلوں کو اس نہایت دلچسپ اور عبرت آموز

کہانی سے محروم رکھا ۔ اس کی وجہ غالباً معاشرے کی سفاکی اور بے رحمی کا احساس تھا ۔ میر اس داستان کو سنانا تو چاہتے تھے لیکن اُن میں اس کو کھل کر بیان کرنے کی ہمت نہیں تھی ۔ البتہ یہ داستان اب میر کے کلام میں ، اور خصوصاً اُن کی غزلوں میں رمز و ایما کے پردوں میں سے جھانکتی ہے اور ان کے ایک ایک شعر میں اپنی جھلکیاں دکھاتی ہے ۔ جن لوگوں کے پاس غزلوں کے کارگہ شیشہ گری کو سمجھنے کا شعور ہے ، وہ میر کی غزلوں کو پڑھ کر اس داستان سے یقیناً لطف اندوز بھی ہو سکتے ہیں اور اس موضوع پر مواد فراہم کر کے عبرت بھی حاصل کر سکتے ہیں ۔ میر نے صحیح کہا ہے :

شعر میں میرے دیکھنا مجھ کو
ہے مرا آئینہ صفائے سخن

میر نے اپنے عشقیہ تجربات کی تفصیل ان غزلوں میں پوری طرح پیش کر دی ہے ، اور ان کو عشق و عاشقی کے گوناگوں تجربات کا ایک حسین مرقع بنا دیا ہے ۔

یہی وجہ ہے کہ میر کی زندگی کے اس پہلو کو سمجھنے کے لیے ان کی غزلیں ہی سب سے بڑا ذریعہ اور وسیلہ ہیں ۔ انھوں نے خود کہا ہے :

عشق کیا سو باتیں بنائیں ، یعنی شعر شعار ہوا
بیتیں جو وے مشہور ہوئیں تو شہروں شہروں رسوا تھے

★ ★ ★

چھٹا باب

شعر و شاعری

اس میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں کہ میر کی عشق و عاشقی ہی ان کی شاعری کی محرک ہوئی - یہ اور بات ہے کہ انھوں نے تجربات عشق کے ساتھ ساتھ زندگی کی سفاکیوں اور زمانے کی ستم رانیوں کو بھی اپنی شاعری کا موضوع بنایا - یہی وجہ ہے کہ میر شاعری میں غمِ عشق اور غمِ زمانہ دونوں کے ان گنت تجربات اپنا جلوہ دکھاتے ہیں -- اور ان کی شاعری اس اعتبار سے منفرد نظر آتی ہے -

میر کی شاعری کا آغاز دلی میں ہوا - انھوں نے جب شاعری شروع کی، اُس وقت اُن کی عمر ایسی کچھ زیادہ نہیں تھی - زیادہ سے زیادہ سولہ سترہ سال کے ہوں گے - میر نے "ذکرِ میر" میں لکھا ہے کہ سید سعادت علی امروہوی نے انھیں ریختے کی طرف توجہ دلائی - چنانچہ میں نے قلعۂ معالی کی زبان میں شعر کہے اور مشق و محنت کی وجہ سے بہت تھوڑے عرصے میں شہر کے اچھے شاعروں میں میرا شمار ہونے لگا، اور لوگ مجھے مستند سمجھنے لگے - میرے اشعار گلی کوچوں میں پڑھے جاتے تھے، اور خاص و عام سب ان سے دلچسپی لیتے تھے - میر کی عمر اس وقت انیس سال سے زیادہ نہیں تھی - اتنی چھوٹی عمر میں اور اتنے قلیل عرصے میں اتنی شہرت کا نصیب ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ میر کی شاعری ابتدا ہی سے مؤثر اور دلکش و دلآویز تھی -

اس عہد کے امیروں اور رئیسوں نے میر کا خیال رکھا، ان کی دل دہی کی اور کسی نہ کسی طرح ان کی کفالت کرتے رہے، ملازمتوں کا انتظام کیا، وظیفے دیے۔ غرض طرح طرح سے انھیں نوازا ۔ ان سب کی بنیاد بھی ایک شاعر کی حیثیت سے ان کی شہرت تھی ۔

یہ بات اپنی جگہ صحیح ہے کہ میر نے سید سعادت علی کے کہنے سے اردو شاعری کی طرف توجہ کی لیکن اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ان کی شاعری کو مقبول بنانے میں خانِ آرزو کی تعلیم و تربیت کا بھی بڑا ہاتھ تھا ۔ خانِ آرزو اس زمانے کے ایسے عالم، ادیب اور شاعر تھے، جن سے اس عہد کے بیشتر شاعروں نے استفادہ کیا، بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ بیشتر نے ان سے رہنمائی حاصل کی اور ان کے شاگرد رہے ۔ میر سے ذاتی معاملات میں ان کا اختلاف ضرور تھا، لیکن اس میں شبہ نہیں کہ خانِ آرزو کی صحبت اور رہنمائی نے انھیں اعلیٰ درجے کا شاعر بنایا ۔ اسی لیے میر نے خانِ آرزو کو "استاد و پیر و مرشد بندہ" کہا ہے — اور یہ بھی لکھا ہے کہ ریختے کے تمام شاعر، جو استادِ فن سمجھے جاتے ہیں، ان کے شاگرد ہیں :

"ہمہ استادان مضبوط فن ریختہ ہم شاگردانِ آں بزرگوارند ۔"[1]

میر کی شہرت میں ان کے ہم عصروں کا بھی خاصا ہاتھ ہے ۔ وہ دلی اور دلی سے باہر بھی ایک شاعر کی حیثیت سے عزت اور احترام کی نظروں سے دیکھے جاتے تھے ۔ سودا، میر درد اور دوسرے

---

۱ ۔ نکات الشعرا، ص ۳

ہم عصر ان کے کلام کو پسند کرتے تھے ، اور ان کی قدر کرتے تھے۔

ایک شاعر کی حیثیت سے میر اپنی جوانی ہی میں مشہور ہو چکے تھے۔ وقت کے ساتھ ساتھ اس میں اضافہ ہوتا گیا۔ چنانچہ جب وہ تیس سال بعد اپنے وطن آگرہ گئے تو وہاں کے شاعروں نے فنِ ریختہ میں انہیں اپنا امام سمجھا اور ان سے عقیدت کے ساتھ ملنے کے لیے آئے۔

دلی کے شاعرانہ ماحول میں میر کا ایک منفرد مرتبہ تھا۔ آنھوں نے اپنی خداداد صلاحیتوں سے اس ماحول میں اپنی ایسی جگہ بنا لی تھی ، جس پر لوگ رشک کرتے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ میر نے ریختے کے ''فنِ بے اعتبار'' کو اعتبار سے ہمکنار کیا ، اس کے لیے جگہ بنائی ، اس کی آبیاری کی اور آن کی ان کوششوں اور کاوشوں سے یہ 'فن بے اعتبار' دیکھتے دیکھتے اعتبار سے ہمکنار ہوکر ایک تناور درخت بن گیا۔ میر سے قبل آردو شاعری ایہام گوئی کی بھول بھلیوں میں بھٹک رہی تھی۔ شاعر اسی اندازِ شعر کو معیار تصور کرتے تھے۔ میر نے اس کو ان بھول بھلیوں سے باہر نکالا اور شاعری کے صحیح راستوں پر گامزن کرنے کی کوشش کی۔ یہ کام انھوں نے اپنی شاعری کے ذریعے سے انجام دیا۔ چنانچہ صاف صاف کہا کہ :

منکر سخن و شعر میں ایہام کا ہوں میں

اور پھر ایک شعر میں اس بات کی وضاحت بھی کی :

کیا جانوں دل کو کھینچے ہیں کیوں شعر میر کے
کچھ ایسی طرز بھی نہیں ، ایہام بھی نہیں

اور پھر شعر کے اصول وضع کیے جن پر خود عمل کر کے انھوں نے اردو شاعری میں اپنا ایک مقام پیدا کر لیا ۔ انھوں نے شاعری میں خیال کی اہمیت واضح کی ۔ مشاہدے اور تجربے کے صحیح احساس کو عام کیا ۔ زندگی کی ترجمانی اور اس کے معاملات و مسائل کی عکاسی کی ضرورت اور اہمیت کو ذہن نشین کرایا ۔ الفاظ کے استعمال کی سحرکاری کا شعور عام کیا ۔ زبان کے صحیح استعمال کی طرف توجہ دلائی اور اس کا اثر یہ ہوا کہ میر اپنے عہد میں شعر و شاعری کے نہ صرف مزاج داں خیال کیے گئے بلکہ انھیں زبان و بیان اور شعر و شاعری کے معاملات و مسائل کا ایک مجتہد تسلیم کیا گیا ۔

میر نے عملی طور پر بھی اپنی شاعری میں ان خصوصیات کو ابھارا ، جن کی اہمیت انھوں نے نظریاتی طور پر واضح کی تھی ۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری ، شعر و شاعری کے بارے میں پیش کیے جانے والے بنیادی اصولوں کی صحیح آئینہ دار ہے ۔ وہ اعلیٰ درجے کی شاعری ہے ۔ بلند مرتبہ شاعری ہے ۔ ایسی شاعری ہے جو زندگی کی صحیح ترجمان اور زمانے کی صحیح مزاج داں ہے ۔ وہ جذبے اور خیال ، جمالیاتی اقدار اور فن کے متوازن امتزاج اور ہم آہنگی کی بہترین مثال ہے ۔ اس کی سادہ پرکاری دامنِ دل کو اپنی طرف کھینچتی ہے ، اور وہ اپنی رنگینیوں اور رعنائیوں سے زمینِ شعر گل و گلزار سے کھلاتی ہے ۔

میر نے اپنی شاعری سے اس زمانے میں ایک ایسی فضا قائم کی جس کی وجہ سے افراد اس شاعری میں دلچسپی لینے لگے ۔ انھوں نے اپنی کوششوں سے مراختوں کا اہتمام کیا ، جس میں ریختے کے شاعر جمع ہو کر اپنا اپنا کلام سناتے تھے ۔ مراختوں کی یہ محفلیں

شروع شروع میں حضرت خواجہ میر دردؒ کے ہاں ہوتی تھیں ، لیکن جب ان کی روحانی مصروفیات بہت بڑھ گئیں تو انھوں نے ان محفلوں کو منعقد کرنے کا کام میر کے سپرد کیا ، اور میر اس کام کے لیے آمادہ ہوگئے ۔ چنانچہ ''نکات الشعرا'' میں لکھتے ہیں :

''مجلس ریختہ ، کہ بہ خانۂ بندہ بتاریخ پانزدہم ہر ماہ مقرر است واللہ بہ ذات ہمیں بزرگ است ۔ زیرا کہ پیش ازیں ایں مجلس بخانہ اش مقرر بود ، از گردش روزگار بے مدار برہم خورد ، از بس کہ بہ ایں احقر اخلاص دلی داشت ۔ گفت کہ ایں مجمع را بہ خانۂ خود معین بکنید ، بہتر است ۔ نظر بر اخلاص آں مشفق عمل کردہ آمد ۔''[1]

حضرت خواجہ میر دردؒ اپنے زمانے کے بہت بڑے صوفی بزرگ اور اردو فارسی کے سربرآوردہ شاعر تھے ۔ انھوں نے میر کو اس قابل سمجھا کہ مراختے کی محفل ان کے ہاں منعقد ہو ۔ درحقیقت یہ میر کی شاعرانہ عظمت کا اعتراف تھا ۔

غرض میر نے اس زمانے کی دلی میں شاعری کی تخلیق کے ساتھ ساتھ شعر و شاعری کی صحیح فضا کو قائم کرنے میں بھی نمایاں کردار ادا کیا ، اور ان کی ان کوششوں سے اس عہد کی دلی میں اردو شاعری سے دلچسپی لینے کی ایک صحت مندانہ فضا پیدا ہوگئی ۔

میر نے شعر و شاعری کی اس فضا کو عام کرنے کے لیے اپنا تذکرہ ''نکات الشعرا'' بھی لکھا جو اردو شاعروں کا پہلا تذکرہ سمجھا جاتا ہے ، اور جس میں اس عہد کے بیشتر شاعروں کے حالات

---

۱ ۔ نکات الشعرا ، ص ۵۰ ۔ ۵۱

اور ان کے کلام کا انتخاب ہے ۔ اس تذکرے سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ میر کے اپنے ہم‌عصر شعرا میں سے بیشتر کے ساتھ اچھے تعلقات تھے، اور میر اپنی ''بے دماغی'' کے باوجود اُن کی عزت کرتے اور ان کی شعری کاوشوں کا احترام کرتے تھے ۔ میر کی انانیت اپنی جگہ، لیکن جوہرِ قابل کے وہ ہمیشہ پرستار رہے ۔ انھیں اپنی بڑائی کا احساس ضرور تھا لیکن دوسرے بڑے شاعروں کی بڑائی کا اعتراف انھوں نے ہمیشہ کیا ۔ سودا ان کے ہم عصر تھے، اور اس عہد کے بڑے شاعر تھے ۔ میر نے اُن کی بڑائی کو تسلیم کیا ہے، اور ''نکات الشعرا'' میں لکھا ہے کہ وہ اتنے بڑے شاعر ہیں کہ ملک الشعرائی ریختہ کا خطاب انھیں زیب دیتا ہے :

"پیش فکر عالیش طبع عالی شرمندہ ۔ شاعر ریختہ ۔ چنانچہ ملک الشعرائی ریختہ او را شاید ۔''[1]

اور خواجہ میر دردؒ کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ شاعر "زور آور ریختہ'' ہیں، اور بعض دوسرے درجے کے شاعروں تک کی دل کھول کر داد دی ہے ۔ البتہ بعض ایسے شاعروں کو وہ پسند نہیں کرتے تھے جن میں شاعرانہ صلاحیت نہیں تھی ۔ اپنی مثنوی اژدر نامہ انھوں نے ایسے ہی شاعروں کے بارے میں لکھی ہے ۔ لیکن اس کی کوئی خاص اہمیت نہیں ہے ۔

شعر و شاعری کی دنیا میں میر نے جو کارنامے انجام دیے، ان کا اعتراف میر کے تقریباً تمام ہم عصروں نے کیا ہے ۔ خانِ آرزو نے ان کی تعریف کر کے لکھا ہے کہ : "از بس کہ ذہن مناسب و

---

۱ ۔ نکات الشعرا، ص ۱۳ ۔

طبع ثاقب یافتہ ۔ در ابتدائے مشق شعر رتبۂ سخن را بہ پایۂ انتہا رسانید ۔'' قائم نے انھیں ''شمع انجمن عشق بازاں ، فروغ محفل سخن پردازاں ، جامع آیات سخندانی ، مجمع کمالات انسانی ، معجز طراز ، کرامت تحریر'' کہا ہے ۔ گردیزی نے انھیں ''سخن سنج بے نظیر'' قرار دیا ہے ۔ میر حسن نے ''افصح فصحائے زماں اور شاعر دلپذیر و سخن سنج بے نظیر'' کہا ہے اور لچھمی نرائن شفیق نے انھیں ''سرتاج شاعران ایں عصر'' کہہ کر یاد کیا ہے ۔

غرض کہ تمام تذکرہ نگاروں نے اسی قسم کے الفاظ میں میر کی شاعرانہ عظمت کا اعتراف کیا ہے ، اور شعر و شاعری کی دنیا میں انھوں نے جو کارنامے انجام دیے ہیں ، ان کی دل کھول کر داد دی ہے ۔

اس میں شبہ نہیں کہ میر نے اس عہد پُرآشوب میں بڑی فعال زندگی بسر کی ۔ وہ زمانے کی ناسازگاری کے ساتھ تمام عمر نبردآزما رہے ۔ زیست کرنے کے لیے جدوجہد بھی کی ۔ روزی کمانے کے لیے نہ جانے کتنے ویرانوں کی خاک چھانی ۔ لیکن اس تگ و دو میں شعر و شاعری کا دامن کبھی بھی ان کے ہاتھ سے نہیں چھوٹا ۔ شاعری کرنا ہر دور میں ، انتہائی ناسازگار حالات کے باوجود ، ان کا محبوب مشغلہ رہا ۔ خود کہتے ہیں :

اور کچھ مشغلہ نہیں ہے ہمیں
گاہ بیگاہ غزل سرائی ہے

اس لیے کہ تخلیق شعر ان کی گھٹی میں پڑی تھی ، اور وہ اس کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتے تھے ۔ اس صورتِ حال نے انھیں پُرگو شاعر

بنایا ، انھوں نے ہزارہا غزلیں کہیں ، سینکڑوں نظموں کی تخلیق کی ، اور ہر صنف شعر میں طبع آزمائی کر کے اس کو آسمان پر پہنچا دیا ۔ انھوں نے غزلوں کے چھ دیوان جمع کیے ۔ شاعرانہ خوبیوں سے بھرپور عشقیہ مثنویاں لکھیں ، اور مثلث ، مخمس ، مسدس ، قطعات ، رباعیات وغیرہ کے انبار لگا دیے ـــ اور اپنی ان تمام تخلیقات کو شاعرانہ خوبیوں سے مالامال کر کے دنیا کے سامنے پیش کر کے اپنا لوہا منوا لیا ۔

میر کی زندگی شاعری سے عبارت تھی ۔ انھوں نے زندگی بھر اس فن کو سنوارا اور نکھارا ، اور اپنی کوششوں سے اس کو انتہائی بلندیوں سے ہمکنار کر دیا ، اور اس شعر و شاعری نے میر کو شہرت کی انتہائی بلندیوں پر پہنچا کر انہیں زندۂ جاوید بنا دیا ۔

میر کو خود اس کا احساس ہے ۔ چنانچہ کہتے ہیں :

دور تک رسوا ہوا ہوں شہروں شہروں ملک ملک
میری شعر و شاعری کا تذکرہ گھر گھر ہے اب

ـــــــ

شعر ہمارے عالم کے ہر چار طرف کیا دوڑے ہیں
کس وادی آبادی میں یہ حرف و سخن مشہور نہیں

ـــــــ

ملکوں ملکوں ، شہروں شہروں ، قصبہ قریہ دیہہ و دیار
شعر و بیت و غزل پر اپنے ہنگامہ ہے گھر گھر آج

ـــــــ

شاعر نہیں جو دیکھا تو تو ہے کوئی ساحر
دو چار شعر پڑھ کر سب کو رجھا گیا ہے

★ ★ ★

ساتواں باب

شناور دریائے خوں

اورنگ زیب عالمگیر کی وفات کے بعد مغلوں کے دورِ آخر میں داخلی خلفشار اور بیرونی یلغار کی وجہ سے جو کچھ ہوا اور اس کے نتیجے میں جو صورتِ حال پیدا ہوئی ، وہ ایک قلزمِ خوں کے اُمڈنے اور موج زن ہونے سے کسی طرح کم نہ تھی ۔ اس زمانے میں عظیم سلطنتِ مغلیہ ایک ایسے انتشار اور افراتفری سے دو چار ہوئی جو عہد اورنگ زیب عالمگیر تک کسی کے خواب و خیال میں بھی نہیں تھی ۔ اس زمانے میں حکومت کا شیرازہ منتشر ہو گیا ۔ معاشی اور معاشرتی زندگی بکھر گئی ۔ سازشوں کا بازار گرم ہوا ۔ اقتدار کی ہوس نے ہر شخص کو آپے سے باہر کر دیا ۔ بادشاہ اُٹھائے بٹھائے جانے لگے ۔ شاہان وقت کی حیثیت شاہ شطرنج سے زیادہ نہ رہی ۔ تعیش اور عیش کوشی کا دور دورہ اس طرح ہوا کہ اُس نے ہر فرد کو اپنے آپ سے بے خبر کر دیا ۔ نادر و ابدالی نے اس صورت حال سے فائدہ اُٹھایا اور ان کی یورشوں اور یلغاروں نے خون کے دریا بہا دیے ۔ جنگیں زندگی کا قانون بن گئیں ۔ قتل و غارت گری ، لوٹ مار اور نوچ کھسوٹ نے ایسا خون بہایا کہ معاشرے اور ماحول نے ایک قلزمِ خوں کی صورت اختیار کرلی ۔

میر اس قلزم خوں کے شناور تھے ۔ انھوں نے یہ سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھا ۔ وہ اس صورتِ حال کے شکار بھی ہوئے ،

اور ان کی زندگی کا بیشتر حصہ اس قلزمِ خون کی شناوری ہی میں گذرا ۔ نادر شاہ کا قتل عام انھوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ۔ ابدالی کی تلواریں اُن کے سامنے چمکیں ۔ مرہٹوں ، جاٹوں اور روہیلوں کے مظالم ان کی آنکھوں کے سامنے ہوئے ۔ دلی کی تباہی ، معاشرے کی بربادی ، زمانے کی سفاکی اور انسان کی بے رحمی کے ایسے ایسے مناظر ان کی آنکھوں کے سامنے آئے جنھوں نے اُن کو ہلا کر رکھ دیا ، اور اس کے نتیجے میں انھوں نے خون کے ایسے آنسو بہائے جس نے اس وقت کی زندگی کو سرخ کر دیا ، اور ماحول اور معاشرے کے ایک ایک کونے سے بوئے خوں آنے لگی ۔

"ذکر میر" میں انھوں نے ان حالات کی تفصیل اپنے حوالے سے پیش کی ہے ۔ اور بڑے ہی جذباتی انداز میں اس تباہی اور بربادی کی تصویریں کھینچی ہیں ۔ میر کی کھینچی ہوئی ان تصویروں کے ذاتی رنگ اور جذباتی آہنگ نے اُن کو تاریخی کتابوں کے بیانات کے مقابلے میں ہزار گنا زیادہ مؤثر بنا دیا ہے ۔ میر اس زمانے میں در بدر مارے مارے پھرے ، جگہ جگہ کی خاک چھانی ، کوڑی کوڑی کو محتاج ہوئے ، تلاش معاش میں سر دھڑ کی بازی لگائی ۔ جنون کا شکار ہوئے ۔ بعض امراء کے ساتھ انھوں نے جنگوں میں بھی خاصا وقت گذارا ۔ سفارتی کام بھی کیے ، تباہی اور بربادی کے ان گنت مناظر بھی دیکھے ، اور اس صورت حال پر خون کے آنسو بھی بہائے ۔ اور اس عالم میں عمر عزیز کے تقریباً پچاس ساٹھ سال دلی کی سرزمین پر گذار دیے ۔

میر ابھی کم عمر ہی تھے جب اپنے والد اور چچا کے انتقال

کے بعد وہ معاش کی تلاش میں اکبر آباد سے دلی پہنچے ۔ صمصام الدولہ امیر الامرا نے خواجہ باسط کی سفارش پر انھیں ایک روپیہ روزانہ پر ملازم رکھ بھی لیا ۔ لیکن کچھ ہی عرصے بعد نادر شاہ نے دلی پر حملہ کیا ، لڑائی ہوئی ، صمصام الدولہ اس لڑائی میں مارے گئے ۔ میر کا وظیفہ بھی بند ہو گیا ۔ نادر شاہ نے دلی میں قتلِ عام کیا اور اس کو خوب لوٹا ۔ پھر امراء و رؤسا پر ظلم و ستم کے ایسے ایسے پہاڑ توڑے کہ چشمِ فلک نے کبھی خواب میں بھی نہیں دیکھے تھے ۔ تاریخ کی کتابوں میں لکھا ہے کہ نادر شاہ نے بعض اہم لوگوں کے سر قلم کیے ، کان کاٹے ، عورتوں کی بے عزتی کی ۔ مخلوقِ خدا اس ظلم و ستم سے اس قدر پریشان اور دل برداشتہ ہوئی کہ بے شمار مردوں اور عورتوں نے کنوؤں میں گر کر خود کشی کر لی ۔ یہ مظالم ڈھاکر نادر شاہ مئی ۱۷۳۹ع میں تختِ طاؤس اور کوہ نور ہیرا ہڑپ کرکے اور تقریباً پچاس کروڑ مالیت کے زر و جواہر اور قیمتی سامان لے کر دلی سے اپنے وطن روانہ ہوا ۔

اس کے اس حملے نے مغلیہ سلطنت کی بنیادیں ہلا دیں اور اس کو تباہ و برباد کرکے رکھ دیا ۔ اس وقت دلی میں محمد شاہ کی حکومت تھی جس کا زیادہ وقت عیش و عشرت میں گذرتا تھا ۔ اس سانحے کے بعد وہ کچھ زیادہ ہی عیش و عشرت میں وقت گذارنے لگا ۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سلطنت کے عمائدین من مانی کرنے لگے ۔ گروپ بندیاں ہو گئیں اور سازشوں کا ماحول پیدا ہو گیا ۔ ایرانی اور تورانی امراء ایک دوسرے کو نیچا دکھانے اور اقتدار حاصل کرنے کی غرض سے طرح طرح کے ہتھکنڈے استعمال کرنے لگے ۔ محمد شاہ کے انتقال کے بعد یہ مناقشات کچھ اور بھی بڑھ گئے ۔ احمد شاہ بادشاہ ہوا ۔ لیکن وہ نام کا بادشاہ تھا ۔ اصل اقتدار

صفدر جنگ کے ہاتھ میں تھا ۔ اس زمانے میں محمد شاہ بادشاہ کے خواجہ سرا جاوید خاں کو نواب بہادر کا خطاب عطا ہوا اور وہ سلطنت کے کاروبار کو چلانے لگا ۔

اس زمانے میں میر بڑی پریشانی کے عالم میں تھے ۔ اس لیے مجبوراً انھوں نے رعایت خاں اور جاوید خاں کی ملازمت بھی کی ، لیکن ان لوگوں کی حرکات ناشائستہ سے بد دل ہوئے اور پریشان ہو کر کچھ عرصے خانہ نشین بھی رہے ۔ عزیزوں اور دوستوں سے ملاقات ترک کر دی اور مطول پڑھتے رہے ۔

سیاسی سطح پر اس زمانے میں صفدر جنگ کی سازشوں کا سلسلہ جاری رہا ۔ اس کی کمینگی کا یہ عالم تھا کہ اس نے دعوت کے بہانے اپنے گھر بلا کر جاوید خاں کو قتل کروایا ۔ میر لکھتے ہیں :

''موسمے کہ صفدر جنگ نواب بہادر را بہ دغا کشت روزگار عالمے برہم خورد ، من نیز بیکار شدم ۔''[1]

لیکن وزیر کے دیوان مہا نرائن نے ان کی پرورش کی ۔ وہ ان کے ملازم ہو گئے ، اور اس طرح ان کے چند مہینے کسی قدر فراغت سے گذرے ۔

لیکن اب احمد شاہ ابدالی نے ہندوستان پر حملوں کا طویل سلسلہ شروع کیا ۔ پہلے چھوٹی موٹی کئی لڑائیاں ہوئیں ۔ ان میں سے ایک لڑائی میں تو خود میر بھی موجود تھے ۔ اس زمانے میں وہ رعایت خاں کے ملازم تھے ۔ چنانچہ ایک لڑائی میں انھیں بھی رعایت خاں کے ساتھ جانا پڑا ۔ میر ''ذکر میر'' میں اس لڑائی کا حال بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

---

۱ ۔ نکات الشعرا ، صفحہ ٦٧ ۔

"من دریں سفر با خان منظور بودم و خدمت ہا نمودم ۔ ہر گاہ شکست فاحشے بر لشکر افغان افتاد و گریخت ۔ معین الملک ناظم لاہور شد ۔ خان مذکور چوں عضو از جا رفتہ ، ترک رفاقت او گرفتہ با صفدر جنگ روانہ شہر شد ۔"[1]

اس لڑائی میں احمد شاہ ابدالی کو شکست ہوئی ، لیکن انتقام کی آگ اس کے دل میں بھڑکتی رہی اور وہ برابر ہندوستان پر حملے کرنے اور لڑائی لڑنے کے خیال میں سرگرداں رہا ۔ چنانچہ اس نے کئی لڑائیاں لڑیں ، اور خلقِ خدا اس کے اس جنونِ جنگ ، کی وجہ سے خاصی پریشان ہوئی ۔

میر نے اس زمانے کی پریشانیوں کا حال تفصیل سے لکھا ہے ۔ ابدالی اس زمانے میں جہاں بھی گیا ، اس نے قتل و غارت گری کا بازار گرم کیا ۔ شرفا کی بیٹیوں سے شادیاں رچائیں ۔ انھیں بے عزت کیا ۔ متھرا اور آگرہ میں اس نے قیامت برپا کی ۔ لوگ سہم گئے مغلوں کی حکومت کا سارا نظام درہم برہم ہو گیا ۔ ابدالی ایک دفعہ پھر لوٹ مار کرکے ، اور اپنی جھولیاں بھرکے اپنے وطن واپس چلا گیا ۔

اس زمانے میں راجہ جگل کشور اور راجہ ناگر مل نے میر کی مدد کی ، اور ان کی سرپرستی کی وجہ سے انھیں کچھ عرصے کے لیے فراغت نصیب ہوئی ۔

لیکن اس کے بعد دلی پرمرہٹوں اور جاٹوں کے حملے شروع ہوئے ، اور اس طرح دلی میں قتل و غارت گری کا ایک اور بازار گرم ہوا ۔

---

۱ ۔ ذکر میر ، صفحہ ٦٨ ۔

میر اس زمانے میں خانہ نشین رہے ، اور قدرت کی ستم ظریفی کے یہ تمام تماشے دیکھتے رہے - مرہٹوں اور جاٹوں کی فوج کے ساتھ ابدالی کا لشکر بھی آ گیا - اس نے خوب لوٹ مار کی - شہر کو آگ لگا دی مکانوں کو جلا دیا - بے شمار لوگ مارے گئے - بہت سے اسیر و پابہ زنجیر ہوئے - دیواریں گرادیں ، چھتیں اڑا دیں ، آبادیاں راکھ کا ڈھیر ہو گئیں - خواص و عوام ایک عذاب میں مبتلا ہوئے -

میر نے اس عذاب الٰہی کی جو تفصیل لکھی ہے ، وہ انھیں کے الفاظ میں پڑھنے کے قابل ہے اس لیے یہاں درج کی جاتی ہے - لکھتے ہیں :-

"بندہ برائے حفظِ ناموس خود بہ شہر ماندم - بعد از شام منادی شد کہ شاہ امان دادہ است - باید کہ رعایا پریشان دل نہ گردد - چوں لختے از شب گذشت غارت گراں دست تطاول دراز نمودہ ، شہر را آتش دادہ - خانہ ہا سوختند و بردند صبح کہ صبح قیامت بود تمام فوج شاہی و روہیلہ ہا تاختند و بہ قتل و غارت پرداختند - دروازہ‌ہا شکستند ، مردماں را بستند - اکثرے را سوختند و سر بریدند - عالمے را بہ خاک و خوں کشیدند - تا سہ شبانروز دست ستم بر نہ داشتند ، از خوردنی و پوشیدنی ہیچ نہ گذاشتند - سقف ہا شگافتند - دیوارہا شکستند ، جگرہا سوختند ، سینہ‌ہا خستند - آں زشت سیرتاں بر درو بام ، اکابراں بہ بے سیرتی تمام ، شیخان شہر بہ حال خراب ، بزرگان محتاج دم آب - گوشہ نشیناں بے جا شدند - اعیان ہمہ گدا شدند - وضیع و شریف عریاں ، کہ خدایان بے خانماں - اکثرے یہ بلا گرفتار ، رسوائی کوچہ و بازار - بسیارے خداگیر

زن و بچہ اسیر برسرِ شہرے ہجوم ، قتل و غارت علی العموم ۔ حال عزیزاں بہ ابتری کشید ۔ جان بسے بہ لب رسید ، زخم می زدند و زباں بہ تلخ می کشودند ۔ زر را می گرفتند و سلاخی می نمودند ۔ با ہر کہ بر می خوردند تا ستر پوش می بردند ۔ جہانے از جہاں ناشاد رفت ۔ ناموس عالمے برباد رفت ۔ شہر نو بہ خاک برابر شد ۔ روز سوم نسق مقرر شد ۔ انزلا خاں نام نسقچی باشی رسید ۔ کلاہہا و نیم تن مردم او کشید ۔ بارے قدغن چیان غارت گراں را از شہر برآوردہ ، باحتیاط پرداختند و آں بے رحم مرداں بہ شہر کہنہ چسپیدہ ، جہانے را ہلاک ساختند ۔ ہفت ہشت روز ایں ہنگامہ گرم بود ۔ اسباب پوشش و قوت یک روزہ در خانہ کسے نماند ۔ سرمرداں بے کلاہ ، زناں بے روسال سیاہ ۔ جمعے چوں راہ ہا قفل بود روزے از زخم پراگندہ خوردند ۔ جماعتے را از سردی ہوا دنداں بہ دنداں کلید و مردند ، بہ بے حیائی تمام تاختند ، روہا بر زمین انداختند غلہ ھا را از گرسنہ چشمے می اندوختند ، و بہ دست غربہ بہ طرح می فروختند ۔ شور غارت زدگاں شہر تا آسمان ہفتم می رسید ۔"[1]

میر کہتے ہیں کہ ان حالات کی وجہ سے میرا حال تو خراب سے خراب تر ہو گیا ۔ میری حالت تو پہلے ہی ناگفتہ بہ تھی ، اب اور بگڑ گئی ۔ میں تو پہلے ہی فقیر تھا ، اب اور بھی فقیر ہو گیا ۔

اس تباہی اور بربادی کے بعد بھی دلی میں قلزم خون موجیں مارتا رہا ۔ اس خون کے کئی دھارے کبھی مرہٹوں کے حملوں ،

---

۱ ۔ نکات الشعرا ، صفحہ ۸۶ ۔

کبھی غلام قادر روہیلہ کی ستم کاریوں کی صورت میں آ کر اس قلزم خون سے ملتے رہے جو دلی میں نادر و ابدالی کی خوں ریزیوں کی صورت میں موجیں مار رہا تھا ۔

میر ان حالات کی وجہ سے اتنے پریشان ہوئے اور اس قلزم خون کی شناوری سے اتنے تنگ آ گئے کہ انھوں نے اس شہر کو خیرباد کہنا ہی مناسب خیال کیا ۔ چنانچہ وہ دلی سے نکلے ، اور بال بچوں کو ساتھ لے کر پیدل چل دیے ۔ کوئی منزل سامنے نہیں تھی ۔ یہ نہیں معلوم تھا کہ کہاں جائیں گے ۔ آٹھ نو کوس چل کر جب ایک سرائے میں درخت کے نیچے ٹھہرے ، تو اتفاقاً راجہ جگل کشور کی بیوی ادھر سے گذریں ۔ انھوں نے میر کو اس عالم میں دیکھا ، تو ترس کھا کر انھیں اپنے ساتھ برسانہ لے گئیں جو ہندؤں کا مقدس مقام تھا ۔ انھوں نے اس برسانہ میں میر اور ان کے خاندان کا ہرطرح کا خیال رکھا اور انھیں اپنے ساتھ کامان بھی لے گئیں ، جو برسانہ سے تین کوس کے فاصلے پر ایک چھوٹی سی جگہ تھی ۔ میر وہاں کچھ عرصے ٹھہرے ۔ پھر وہاں سے کمھیر گئے ۔ وہاں صفدر جنگ کے سابق خزانچی رادھا کشن کے بیٹے بہادر سنگھ نے میر کی مدد کی ، اور انھوں نے تھوڑا سا وقت وہاں کسی قدر اطمینان اور چین سے گذارا ۔ اسی سفر میں میر کی ملاقات اعظم خاں سے ہوئی جو محمد شاہ کے زمانے میں شش ہزاروی منصب پر فائز تھا ۔ میر اس سے ملے ، اور اس نے ہر طرح ان کی مدد کی یہیں اُن کی ملاقات راجہ ناگر مل سے ہوئی ، جو اب شاہجہان آباد کو چھوڑ کر یہیں آباد ہوگئے تھے ۔ کیونکہ یہاں زیادہ عافیت تھی ۔ میر نے وہیں رہنے کا ارادہ کر لیا ۔ راجہ نے ان کی مدد کی اور ان کا وظیفہ جاری رکھا ۔

اس عرصے میں ابدالی نے پھر دلی پر حملہ کیا ، اور ۱۷۶۱ء میں پانی پت کی تیسری لڑائی ہوئی جس میں کشت و خون کے بعد ابدالی کو کامیابی ہوئی ۔ دلی ایک دفعہ پھر لٹی ۔ اور قلزمِ خون ایک بار پھر موجزن ہوا ۔ جب تسلّط ہوا تو میر کے محسن راجہ ناگر مل نے مصلحت کے پیش نظر احمد[۳] شاہ ابدالی سے ملاقات کی ۔ اس طرح کچھ صلح صفائی ہوگئی اور اس نے راجہ کو نیابت کا عہدہ دیا ۔ صفدر جنگ کے بیٹے شجاع الدولہ سے بھی راجہ کی صلح صفائی ہوگئی ۔ اس موقع پر میر بھی راجہ کے ساتھ تھے ۔

اب جو میر دلی پہنچے تو شہر کا وہ عالم دیکھا جو انتہائی تکلیف دہ تھا ۔ شہر میں ہر طرف ویرانی نظر آئی ۔ حیران و پریشان شہر میں گھومتے رہے ، روتے رہے اور عبرت حاصل کرتے رہے ۔ مکانوں کو پہچاننا مشکل ہو گیا دور دور تک آبادی نظر نہیں آئی ۔ عمارتوں کے آثار باقی نہ رہے ۔ ان کے مکینوں کا پتہ نشان نہ ملا ۔ بازار ختم ہو گئے ۔ بازاروں میں جو حسین و جمیل لڑکے نظر آتے تھے وہ خدا جانے کہاں چلے گئے ؟ عاشق مزاج لوگ جو بازاروں میں البیلے گھومتے پھرتے تھے ، کہیں نظر نہ آئے ۔ پیران پارسا شہر کو چھوڑ کر ویرانوں میں چلے گئے ۔ محل برباد نظر آئے ۔ گلی کوچوں کا وجود تک باقی نہ رہا ۔ ہر طرف وحشت سی برستی ہوئی نظر آئی ۔

میر لکھتے ہیں کہ میں اس محلے میں بھی گیا ، جہاں میں رہتا تھا ، جہاں شب و روز شعر و سخن کے چرچے رہتے تھے اور جہاں میں شعر پڑھا کرتا تھا ، اور عاشقانہ زندگی بسر کرتا تھا ۔ خوبصورت لوگوں سے عشق کرتا تھا ۔ ان کے حسن و جمال کو

سراہتا تھا ۔ ایک لمحے کے لیے بھی ان سے جدا نہیں ہوتا تھا ۔
جہاں میں مختلف قسم کی بزم آرائیاں کرتا تھا ۔ حسینوں کو
دعوت دیتا تھا اور ان کو اپنا مہمان بناتا تھا ۔ لیکن اب وہاں دور
دور تک کوئی ایسا شخص نظر نہ آیا جس سے میں باتیں کرتا ۔
کوئی معقول انسان نہ ملا جس کے ساتھ چند لمحے گذارتا ۔ اپنی کہتا
اور ان کی سنتا ۔ میں ویران راستوں پر کھڑا ہوا حیرت کے عالم میں
تباہی اور بربادی کے ان مناظر کو دیکھتا رہا ۔ یہ سب کچھ دیکھ
کر بہت دکھ ہوا ۔ یہ صدمہ برداشت کے قابل نہیں تھا ۔ طبیعت
گھبرائی اور میں نے یہ فیصلہ کیا کہ ان مناظر کو دیکھنے کے لیے
پھر کبھی ادھر کا رخ نہیں کروں گا ۔

دلی میں میر نے اس قسم کے صدمے بہت اٹھائے ۔ قتل و غارت
گری کے ساتھ ساتھ شہر کی تباہی اور ویرانی کے ان مناظر نے میر
کو زندگی سے بیزار کر دیا ۔ اس آشوب قیامت نے انہیں کہیں کا
نہ رکھا ۔ تقریباً نصف صدی انہوں نے دلی کی سرزمین پر اسی طرح
گذاری ، اور ایک ایسی زندگی بسر کی جس میں کوئی دلکشی نہیں
تھی ۔ مسلسل جنگ و جدال اور کشت و خون کی فضا نے انہیں
اتنا پریشان کر دیا کہ زندگی میں انہیں کوئی دلچسپی ہی باقی نہ
رہی ۔ صرف زیست کرنے اور زندہ رہنے کے لیے وہ ادھر ادھر ہاتھ پاؤں
مارتے رہے ۔ لوگوں کے سامنے ہاتھ پھیلاتے رہے ۔ امداد کے لیے
درخواستیں کرتے رہے ۔ اپنا اور اپنے خاندان کے افراد کا پیٹ پالنے
کے لیے مختلف قسم کی ملازمتیں کرتے رہے ۔ لیکن اس سے کچھ
حاصل نہ ہوا ۔ وقتی طور پر کبھی تھوڑا سا سکون نصیب ہوتا ،
لیکن پھر حالات ناساز گار ہو جاتے ، اور پھر بے سکونی اور

پریشانی ان کا مقدر بن جاتی - یہ مرمر کے جینے والی کیفیت تھی جس سے میر دلی کے دوران قیام میں دو چار ہوتے رہے - تقریباً پچاس ساٹھ سال کا عرصہ میر نے اسی عالم میں گذارا -

میر میں بے شمار خدا داد صلاحیتیں تھیں - ان کی شاعری کا بیشتر حصہ اسی زمانے میں ، انھیں ناسازگار حالات کے سائے میں تخلیق ہوا ، اور اس اعلیٰ درجے کی بلند پایہ شاعری نے انھیں شہرت کی انتہائی بلندیوں پر پہنچا دیا - اس کی بدولت وہ ہر دل عزیز ہوئے - اسی کی وجہ سے انھوں نے عوام اور خواص دونوں کے دلوں میں اپنی جگہ بنائی - اسی کے توسط سے اس وقت کے امراء روسا تک ان کی رسائی ہوئی - اور اسی کی وجہ سے ان کا احترام کیا گیا ، اور وہ ایک ایسے مقام پر پہنچے جہاں تک پہنچنا ہر ایک کے بس کی بات نہیں ہوتی - انسان اس عالم میں زندگی بسر کرے تو خون تھوکنے لگتا ہے -

غیر معمولی قوتِ ارادی نے ان حالات میں میر کو زندہ رکھا - اُن کی زندگی کے واقعات اس حقیقت کو واضح کرتے ہیں کہ وہ ان حالات کے صرف خاموش تماشائی ہی نہیں تھے ، انھوں نے اُن کو صرف اپنی آنکھوں سے دیکھا ہی نہیں تھا ، ان سے نبرد آزما ہونے کی کوشش بھی کی تھی - وہ بعض جنگوں میں اپنے محسنوں کے ساتھ شریک بھی رہے ، اپنی خدا داد قوتِ فیصلہ کا اظہار بھی کیا - اپنی دانش مندی اور معاملہ فہمی سے بعض بگڑتے ہوئے حالات کو سدھارنے کی کوشش بھی کی - اور پھر سب سے بڑی بات یہ ہے کہ ان ناسازگار حالات میں اُن کے قدم ڈگمگائے نہیں - ان ناسازگار حالات نے

ان کے کردار کو متزلزل نہیں کیا ۔ وہ کبھی نیچے نہیں گرے ۔
انھوں نے اپنی خودی اور خوداری کو کبھی مجروح نہیں ہونے دیا ۔
برخلاف اس کے ہمیشہ لیے دیے رہے ۔ اور شکست و ریخت کی آن
آندھیوں کا اُنھوں نے بڑی جرأت مندی سے مقابلہ کیا جو آن کے
آس پاس طوفانی انداز میں چل رہی تھیں ۔

میر اس اعتبار سے منفرد اور عظیم المرتبت نظر آتے ہیں !

آٹھواں باب

ہجرت

میر قلزمِ خوں کی اس شناوری کے لیے تقریباً ۱۱۹۵ھ ۱۷۸۱ع تک دلی اور مضافاتِ دلی میں رہے ۔ ایمان کی بات یہ ہے کہ راجہ ناگر مل اور راجہ جگل کشور کی رفاقت ہی نے انھیں دلی میں اس وقت تک روکے رکھا ، ورنہ اُن کے پاؤں تو عرصہ ہوا اکھڑ چکے تھے ۔ دلی کی تباہی اور بربادی ان سے دیکھی نہیں جاتی تھی ۔ آئے دن کے کشت و خوں نے انھیں اپنے اس محبوب شہر سے برگشتہ کر دیا تھا ، اور وہ بہت دل برداشتہ رہتے تھے ۔ اُن کا کاماں جانا ، کمھیر اور سورج مل کے قلعوں میں قیام ، سب کچھ اسی وجہ سے تھا کہ دلی میں ناسازگار حالات نے ان پر عرصۂ حیات تنگ کر دیا تھا ۔ یہاں سے تو اب لشکر گزرتے تھے ۔ یہاں تو اب صرف جنگیں لڑی جاتی تھیں ۔ یہاں تو اب صرف کشت و خوں کا بازار گرم ہوتا تھا ۔ یہاں تو اب صرف لوٹ مار اور نوچ کھسوٹ ہوتی تھی ۔ یہاں تو اب ہر چیز سے بوئے خوں آتی تھی ۔ اس لیے انھوں نے کلیجے پر پتھر رکھ کر اپنے محبوب شہر دلی کو چھوڑنے اور پورب کی طرف ہجرت کرنے کی ٹھانی ۔ خصوصیت کے ساتھ اس وقت جب شجاع الدولہ کے انتقال کے بعد اودھ کی سلطنت اُن کے بیٹے آصف الدولہ کے ہاتھ میں آئی ، اور انھوں نے میر کی شاعری کی شہرت کی وجہ سے انھیں لکھنؤ بلانا چاہا ۔

میر لکھتے ہیں کہ : ”میں اس زمانے میں آس پاس اور گرد و پیش

کے ناسازگار حالات سے پریشان ہوکر خانہ نشیں تھا ، اور میری یہ خواہش تھی کہ کسی طرح شہر سے نکل جاؤں ۔ لیکن وسائل نہیں تھے ، اس لیے ہمت نہیں پڑتی تھی ۔ کس برتے پر سفر کرتا ! جب آصف الدولہ کو یہ معلوم ہوا کہ میر دلی میں سخت پریشان ہیں تو انھوں نے یہ خیال ظاہر کیا کہ میر کسی طرح ان کے پاس آ جائیں ۔ نواب سالار جنگ نے اس کے لیے اعانت کی ، اور نواب آصف الدولہ کو لکھا کہ اگر میر کے لیے زادِ راہ کا انتظام کر دیا جائے گا تو وہ ضرور لکھنؤ آ جائیں گے ۔ آصف الدولہ نے زادِ راہ بھیجا ، اور یہ خط لکھوایا کہ میر کو بغیر کسی تاخیر کے لکھنؤ آ جانا چاہیے ۔" آصف الدولہ پر شرافت ، نیکی اور سخاوت ختم تھی ۔

میر تو دل برداشتہ بیٹھے ہی تھے ، اس خط کے ملتے ہی دلی کو چھوڑنے اور لکھنؤ کی طرف ہجرت کرنے کے لیے تیار ہوگئے ، اور بغیر کسی معاون و مددگار یا قافلے کے دلی سے چل دیے ۔ چند روز سفر کر کے فرخ آباد پہنچے ۔ فرخ آباد کے رئیس مظفر جنگ نے میر کو چند روز اپنے پاس ٹھہرانے کی کوشش کی لیکن وہ زیادہ دن ٹھہرنے کے لیے تیار نہ ہوئے ۔ دو دن کے بعد وہاں سے رخصت ہوکر لکھنؤ کی طرف چل دیے ۔ چند روز کے بعد منزلِ مقصود پر پہنچے ۔ نواب سالار جنگ سے ملے ـــ انھوں نے میر کی بڑی عزت کی ، اور نواب آصف الدولہ کی طرف سے ایسی تمام چیزیں میر کو بھجوا دیں ، جن کی انھیں ضرورت تھی ۔ لکھنؤ میں میر کی بڑی آؤ بھگت ہوئی ۔ شہر میں شور مچ گیا کہ میر صاحب دلی کو چھوڑ کر لکھنؤ آ گئے ہیں ۔ ایک شاعر کی حیثیت سے میر کی شہرت بہت تھی ۔ اس لیے لکھنؤ کے با ذوق لوگوں نے انھیں ہاتھوں ہاتھ لیا ۔

آزاد نے 'آبِ حیات' میں اس واقعے کی ایک خیالی تصویر بنائی ہے ، لیکن یہ تصویر ہے بہت دلکش کیونکہ اس سے اُس فضا کا اندازہ ہوتا ہے جو میر صاحب کے آنے کی وجہ سے اس وقت لکھنؤ میں پیدا ہوئی ۔

آزاد لکھتے ہیں :

''جب لکھنؤ چلے تو ساری گاڑی کا کرایہ بھی پاس نہ تھا ۔ ناچار ایک شخص کے ساتھ شریک ہوگئے اور دلی کو خدا حافظ کہا ۔ تھوڑی دور آگے چل کر اس شخص نے کچھ بات کی ۔ یہ اُس کی طرف سے منہ پھیر کر ہو بیٹھے ۔ کچھ دیر کے بعد پھر اُس نے بات کی ۔ میر صاحب چیں بجبیں ہوکر بولے کہ ''صاحب قبلہ ! آپ نے کرایہ دیا ہے ۔ بے شک گاڑی میں بیٹھیے مگر باتوں سے کیا تعلق'' ۔ اس نے کہا 'حضرت ! کیا مضائقہ ہے ۔ راہ کا شغل ہے ۔ باتوں میں ذرا جی بہلتا ہے' ۔ میر صاحب بگڑ کر بولے کہ 'خیر آپ کا شغل ہے ۔ میری زبان خراب ہوتی ہے' ۔

لکھنؤ میں پہنچ کر ، جیسا کہ مسافروں کا دستور ہے ، ایک سرا میں اُترے ۔ معلوم ہوا کہ آج یہاں ایک مشاعرہ ہے ؛ رہ نہ سکے ۔ اسی وقت غزل لکھی ، اور مشاعرے میں جا کر شامل ہوئے ۔ ان کی وضع قدیمانہ ، کھڑکی دار پگڑی ، پچاس گز کے گھیر کا جامہ ۔ ایک پورا تھان پتولیے کا کمر سے بندھا ۔ ایک رومال پٹری دار تہہ کیا ہوا اس میں آویزاں ، مشروع کا پاجامہ جس کے عرض کے پائنچے ۔ ناگ پھنی کی انی دار جوتی جس کی ڈیڑھ بالشت اونچی نوک ۔ کمر میں ایک طرف سیف یعنی

سیدھی تلوار ، دوسری طرف کٹار ، ہاتھ میں جریب ـــ غرض جب داخلِ محفل ہوئے تو وہ شہر لکھنؤ ، نئے انداز ، نئی تراشیں ، بانکے ٹیڑھے جوان جمع ۔ انھیں دیکھ کر سب ہنسنے لگے ۔ میر صاحب بے چارے غریب الوطن ، زمانے کے ہاتھ پہلے ہی دل شکستہ تھے ، اور بھی دل تنگ ہوئے ، اور ایک طرف بیٹھ گئے ۔ شمع ان کے سامنے آئی تو پھر سب کی نظر پڑی ، اور بعض اشخاص نے پوچھا کہ ''حضور کا وطن کہاں ہے'' ؟ میر صاحب نے یہ قطعہ فی البدیہہ کہہ کر غزل میں داخل کیا :

کیا بود و باش پوچھو ہو پورب کے ساکنو !
ہم کو غریب جان کے ہنس ہنس پکار کے
دلی جو ایک شہر تھا عالم میں انتخاب
رہتے تھے منتخب ہی جہاں روزگار کے
اس کو فلک نے لوٹ کے ویران کر دیا
ہم رہنے والے ہیں اسی اجڑے دیار کے

سب کو حال معلوم ہوا ۔ بہت معذرت کی اور میر صاحب سے عفوِ تقصیر چاہی ۔''[1]

آزاد کے اس بیان سے میر کی تصویر آنکھوں کے سامنے ضرور آ جاتی ہے ، اور اس ماحول کا بھی کسی قدر اندازہ ہو جاتا ہے جو اس وقت لکھنؤ میں تھا ، اور اس لحاظ سے یہ بیان دلچسپ ہے ۔ لیکن اس کی صداقت کا کوئی ثبوت موجود نہیں ہے ـــ خود میر کے بیان سے اس کی تردید ہو جاتی ہے ۔ ''ذکرِ میر'' میں انھوں نے

---

۱ ۔ آزاد : آبِ حیات ، ص ۲۰۵ ۔

لکھا ہے کہ وہ آصف الدولہ کی دعوت پر لکھنؤ آئے تھے - نواب سالار جنگ سے ان کی ملاقات ہو چکی تھی ، انھوں نے آصف الدولہ کو ان کے آنے کی اطلاع بھی کر دی تھی - ضرورت کی چیزیں بھی بھیج دی تھیں - میر کا اس طرح مشاعرے میں جانا بھی محلِ نظر ہے -

میر نے ''ذکرِ میر'' میں لکھا ہے کہ لکھنؤ پہنچنے کے چار پانچ روز بعد نواب آصف الدولہ ایک جگہ مرغ لڑانے کے لیے آئے ، وہاں میں بھی موجود تھا - میں خدمت میں حاضر ہوا - سمجھ گئے کہ میر ہیں ، گلے ملے ، اور مجھے اپنے ساتھ اس جگہ پر لے گئے جو ان کے لیے مخصوص تھی - پھر مجھے اپنے اشعار سنائے - میں نے کہا ، ''سبحان اللہ'' ! خوب داد دی ، مجھ سے بھی کچھ شعر سنے - نواب سالار جنگ نے نواب آصف الدولہ کو بتایا کہ میر صاحب آپ کے بلانے پر لکھنؤ آئے ہیں ، انھیں کوئی جگہ عنایت ہو - نواب نے کہا "میں کچھ مقرر کر دوں گا ، اور اطلاع دے دوں گا'' - دو تین دن بعد میر نواب آصف الدولہ کے پاس پہنچے ، اور تازہ کہا ہوا قصیدہ سنایا - نواب نے سنا اور اپنے ملازموں میں مجھے بھی شامل کرلیا - مجھ پر بڑے مہربان ہیں ، اور خاص خیال رکھتے ہیں'' -

غرض لکھنؤ میں میر کی بہت عزت افزائی ہوئی - نواب ان کا بڑا خیال رکھتے تھے ، اور سیر و تفریح کے موقع پر بھی اپنے ساتھ لے جاتے تھے - آصف الدولہ کو شکار کا شوق تھا - لکھنؤ کے قریب ترائی کے علاقے میں اکثر شکار کو جاتے تھے - میر نے اس سفر کو نظم کیا ہے ، اور کئی نظموں میں شکار کی تفصیل لکھی ہے - ''ذکرِ میر''

میں لکھتے ہیں کہ ’’میں نواب آصف الدولہ کے ساتھ اب اطمینان و آرام کی زندگی بسر کر رہا ہوں ۔ شکار کو جاتے ہیں تو مجھے بھی ساتھ لے جاتے ہیں ۔ بہرائچ تک گئے تھے ، میں بھی ان کے ساتھ رہا ۔ پھر ہمالیہ کی ترائی میں بھی شکار کے لیے گئے ، تین مہینے کے بعد واپس آئے ۔ اس سفر میں خاصی تکلیفیں اٹھانی پڑیں ، لیکن یہ شکار زندگی کا عجیب و غریب تجربہ تھا ۔ میں نے اس سفر کے متعلق شکار نامے لکھے جن کو نواب نے پسند کیا ، اور خود بھی اس پر طبع آزمائی کی‘‘

یہ شکار نامے میر کے کلیات میں موجود ہیں ، اور اس سفر کی تفصیل و جزئیات کے اعتبار سے خاصے دلچسپ ہیں ۔

ان شکار ناموں میں جنگلوں ، بیابانوں ، پرندوں اور جانوروں کی بہت تفصیل ہے ۔ دوسرے شکار نامے کے آخری حصے کے چند اشعار آصف الدولہ کے بارے میں ہیں ، جن کی فرمائش پر یہ شکار نامے لکھے گئے ، اور جن سے ان کی شخصیت پر بھی روشنی پڑتی ہے ۔ اس سفر میں میر کا بہت خیال رکھا گیا ۔ ان کے لیے یہ ایک خوشگوار تبدیلی بھی تھی ۔ لیکن ان تمام باتوں کے باوجود میر لکھنؤ کی زندگی سے اپنی بیزاری کا اظہار کرتے ہیں اور وطن واپس جانے کی خواہش ان کے دل میں انگڑائیاں سی لیتی ہے :

زمانے میں ہے رسم کہنے کی کچھ
امید اس سے ہے نام رہنے کی کچھ
کسو سے ہوئی شاہنامے کی فکر
کہ محمود کا لوگ کرتے ہیں ذکر
گیا شہ جہاں نامہ کہہ کر کلیم
دلِ شاعراں رشک سے ہے دو نیم

کنھوں نے کہی عشق کی داستاں
ہوا کوئی کہانے سے ہم داستاں
پئے آصف الدولہ میں نے بھی میر
کہے صید نامے بہت بے نظیر
مگر نام نامی یہ مشہور ہو
گئے پر بھی لوگوں میں مذکور ہو
زہے آصف الدولہ داد گر
سخن ور نواز اور عاشق ہنر
دہش سے جہاں اُس کے رونق پذیر
وزیر ابنِ دستور ابنِ وزیر
کریمی کرے تو جہاں در جہاں
کف جود خورشید سا زر فشاں
سراپائے احساں تمامی ہمہ
ہمہ تن مروت سراسر کرم
ہمیشہ رہے گرمِ سیر و شکار
یہ حرف و حکایت بھی ہے یادگار
قفائے غزل اک رباعی کہو
سخن آگے موقوف چپکے رہو
بہت کچھ کہا ہے کرو میر بس
کہ اللہ بس اور باقی ہوس
متاعِ ہنر پھیر لے کر چلو
بہت لکھنؤ میں رہے گھر چلو

شجاع الدولہ کے وقت سے انگریزوں کا عمل دخل اودھ کی سلطنت میں خاصا بڑھ گیا تھا۔ انگریز گورنر وغیرہ لکھنؤ آتے رہتے تھے، اور

آن کا شان دار استقبال ہوتا تھا ۔ میر بھی ان میں سے ایک محفل میں شریک تھے ، جس کی تفصیل انھوں نے "ذکرِ میر" میں لکھی ہے ۔ میر کہتے ہیں کہ گورنر بہادر نواب کی دعوت پر لکھنؤ آئے ۔ ایک ایک منزل پہلے نواب ان کے استقبال کو گئے اور اپنے ساتھ انھیں لکھنؤ لائے ۔ بڑا شاندار استقبال ہوا ۔ بڑی شاندار دعوت ہوئی ۔ استقبال میں گھوڑے ہاتھی موجود تھے ۔ وہ لکھنؤ پہنچے تو جس محل میں قیام کیا آس میں عطر و گلاب چھڑکا گیا اور محل کو خوب آراستہ کیا گیا ۔ کھانے کے لیے قسم قسم کی چیزیں رکھی گئیں ۔ رات کو حسین و جمیل عورتوں کا رقص بھی ہوا ۔ یہ عورتیں جنت کی حوروں سے بھی زیادہ خوبصورت تھیں ۔ طرح طرح کے کھانوں کا اہتمام ہوا ۔ قلیے ، دو پیازے ، قسم قسم کے کباب ، پلاؤ ، قورمے وغیرہ دسترخوان پر چنے گئے ۔

میر نے اس دعوت کی تفصیل جس طرح لکھی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس موقع پر موجود تھے ۔ ظاہر ہے کہ میر کا اس محفل میں موجود ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ نواب آصف الدولہ ان کو بڑی اہمیت دیتے تھے ، اور آن کا خاص خیال رکھتے تھے ۔

میر کا قیام لکھنؤ میں مجموعی طور پر خوشگوار رہا ۔ ان کی زندگی میں صرف یہی زمانہ ایسا ہے جس میں انھیں کسی حد تک سکون و اطمینان نصیب ہوا ، اور انھوں نے اپنی زندگی فارغ البالی کے ساتھ بسر کی ۔ دلی کی زندگی کے مقابلے میں یہ ایک نہایت خوش آیند تبدیلی تھی ۔ لیکن میر اس تبدیلی سے بھی مطمئن نہیں ہوئے ۔ لکھنؤ کا تہذیبی ماحول انھیں پسند نہیں آیا ۔ مصحفی اور جرأت ، سید انشا ، اور سعادت یار خاں رنگین کے اثر سے جو فضا لکھنؤ میں پیدا ہوئی

تھی وہ اس سے کوئی ذہنی مناسبت نہیں رکھتے تھے - یہی وجہ ہے کہ میر لکھنؤ کے تہذیبی ماحول میں بھی کچھ خوش نہ رہے - دلی انھیں یاد آتی رہی اور وہ وہاں کی تہذیب و ثقافت کو یاد کر کے اس کا ماتم کرتے رہے - دلی کے اُجڑنے اور وہاں کی تہذیب کے بگڑنے کا غم ساری زندگی اُن کے دم کے ساتھ رہا - وہ دلی کے محلوں، وہاں کے گلی کوچوں اور بازاروں، محلوں اور حویلیوں، امیروں اور رئیسوں سب کو یاد کرتے تھے- ۱۱۹۶ھ ۱۷۸۲ء میں وہ لکھنؤ پہنچ گئے تھے- اس وقت ان کی عمر تقریباً ساٹھ سال تھی - اس عمر میں کسی شخص کے لیے نئے ماحول سے مطابقت پیدا کرنا، اور اپنے ماضی کو فراموش کر دینا مشکل ہوتا ہے - پھر میر کو یہ غم بھی تھا کہ جس تہذیبی روایت سے اُن کا تعلق ہے، وہ اب باقی ہی نہیں ہے - دلی تو ہر اعتبار سے اُجڑ چکی تھی اور میر نے اپنی آنکھوں سے اس کو اُجڑتے ہوئے دیکھا تھا - اس لیے وہ انھیں کچھ زیادہ ہی یاد آتی تھی، اور وہ اس کے غم میں کچھ زیادہ ہی سوگوار رہتے تھے - یہ شعر انھوں نے اسی کیفیت کے زیرِ اثر کہا تھا :

خرابہ دلی کا دہ چند بہتر لکھنؤ سے تھا
وہیں اے کاش مر جاتا سراسیمہ نہ آتا یاں

بہرحال دلی سے میر کی ہجرت بھی ان حالات کی وجہ سے ایک المیہ بن گئی - یہاں مادی طور پر ان کے حالات کسی حد تک بہتر ضرور ہوئے - کسی حد تک یکسوئی اور آسودگی بھی انھیں نصیب ہوئی - لیکن جذباتی اور ذہنی طور پر اپنے اس شعر کے مصداق وہ حیران و خفا اور اُداس و دلگیر ہی رہے :

یوں ہی حیران وخفا جوں غنچۂ تصویر ہوں
عمر گزری پر نہ جانا میں کہ کیوں دلگیر ہوں

میر نے لکھنؤ میں اپنی زندگی کے تقریباً تیس سال گزار ے ، اور یہیں ان کا انتقال ۱۲۲۵ھ ۱۸۱۰ع میں ہوا ۔ جمعہ کا دن تھا ۔ شام کا وقت تھا ۔ اکھاڑہ بھیم کے قبرستان میں دفن ہوئے ۔ یہ بہت بڑا قبرستان تھا جو کسی زمانے میں وزیر گنج اور گولہ گنج سے لے کر باغ شیر جنگ اور مولوی انوار صاحب کے باغ تک پھیلا ہوا تھا ۔ آغا میر کی ڈیوڑھی میں جب چھوٹی لائن کا اسٹیشن بنایا گیا ، اور ریل نکالی گئی تو اس کو برابر کر دیا گیا ۔ اب اس قبرستان کا نام و نشان تک باقی نہیں ہے ۔ اب اس کے سینے پر وہ ریل چلتی ہے جس کو پہلے اودھ روہیلکھنڈ ریلوے (O R.R.) کہتے تھے اور اب یہ روہیلکھنڈ کمایوں ریلوے (R.R.K,) کے نام سے مشہور ہے ۔ اب ریلوے لائن کے ایک طرف نشیب میں صرف چند قبریں باقی رہ گئی ہیں ، ان میں ایک قبر میر کی بھی ہے جس کو لوگ اب شاہ جشن کا مزار کہتے ہیں ۔

میر کے دیوان کا جو نسخہ محمود آباد کے کتب خانے میں موجود ہے ، اس پر میر محسن کے ہاتھ کی لکھی ہوئی یہ عبارت اس سلسلے میں گراں قدر معلومات فراہم کرتی ہے ۔ محسن لکھتے ہیں :

”بروز جمعہ بستم شعبان المکرم وقت شام ۱۲۲۵ھ ایک ہزار و دو صد و بست و پنج ہجری بود کہ میر محمد تقی صاحب میر تخلص ، صاحب ایں دیوان چہارم ، در شہر لکھنؤ در محلہ سٹھٹی بعد طئی نہ عشرۂ عمر بہ جوار رحمت ایزدی پیوستند ، و بروز شنبہ بست و یکم ماہ مذکور سنہ الیہ وقت دوپہر در اکھاڑہ بھیم ، کہ قبرستان مشہور است ، نزد قبور اقربائے

خویش مدفون شدند ۔ و چہار دیوان ، دیوانِ خود را ، کہ
ایں دیوان چہارم ہم ازاں جملہ است ، بہ محرر سطور المخاطب
بہ زین الدین احمد تجاوز اللہ عن سیاتہ ، در حین حیات خویش
بکمال رغبت حل کردہ بخشیدند ۔ خدایش بیامرزاد ۔''۱

اسی نسخے میں نوادالکملا کی جو عبارت نقل کی گئی ہے ، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ میر کے جنازے میں چار سو کے قریب آدمی شریک تھے ۔ اس کے علاوہ عقیدت مندوں نے بہت بڑی تعداد میں غائبانہ نماز جنازہ بھی ادا کی ۔۲

راقم الحروف نے اپنی طالب علمی کے زمانے میں میر کے مزار کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کی کوشش کی ۔ میرے استاد پروفیسر سید مسعود حسن صاحب رضوی ادیب اور کرم فرما اور بزرگ نواب مرزا جعفر علی خاں صاحب اثر لکھنوی نے مجھے یہ بتایا کہ میر کی قبر ریلوے لائن کے دائیں جانب نشیب میں واقع ہے ۔ لیکن افسوس ہے کہ لوگ اب اس کو شاہ جشن کا مزار کہتے ہیں ۔ میں ایک دن اس مزار کو دیکھنے کے لیے گیا ۔ وہاں مجھے ایک بہت ہی ضعیف اور عمر رسیدہ عورت ملی ۔ میں نے اس سے پوچھا کہ ''یہ کس کا مزار ہے'' ؟ اس نے جواب دیا کہ ''یہ شاہ جشن'' کا مزار ہے ۔ ہم لوگ فیض آباد میں رہتے تھے ۔ وہاں آج سے کوئی تیس چالیس سال قبل میرے شوہر کو یہ بشارت ہوئی تھی کہ لکھنؤ میں ڈیوڑھی آغا میر اسٹیشن کے قریب ریلوے لائن کے پاس شاہ جشن کا مزار ہے ۔ وہاں جاؤ ، اور ان کی خدمت کرو ۔ چنانچہ ہم لوگ یہاں

---

۱ ۔ دیوانِ میر ، نسخہ محمود آباد ۔
۲ ۔ بحوالہ خواجہ احمد فاروقی ۔ میر ، حیات اور شاعری ۔

آ گئے ۔ میرے شوہر کا تو انتقال ہو چکا ہے ۔ میں اب یہیں ایک جھونپڑی میں رہتی ہوں ، اور شاہ جشن کی خدمت کرتی ہوں ۔ جمعرات کو لوگ خاصی تعداد میں آ جاتے ہیں ، نذر نیاز کی کچھ شیرینی اور چراغی وغیرہ کے کچھ پیسے مل جاتے ہیں ۔ اس سے گزر بسر ہو جاتی ہے"۔

مجھے اس کہانی کو سن کر بہت افسوس ہوا ۔ اس لیے کہ صرف تیس چالیس سال کے عرصے میں میر کا یہ مزار شاہ جشن'' کا مزار بن گیا ، اس لیے کہ ایک شخص کو خواب میں شاہ جشن'' کے مزار پر جانے اور اُن کی خدمت کرنے کی 'بشارت' ہوئی ، اور اس 'بشارت' نے میر کے مزار کا نام و نشان تک مٹا دیا ۔

اور میں یہ سوچتا رہا ، اور اب بھی یہ سوچتا ہوں ، کہ میر زندگی میں تو خیر ایک المیہ تھے ہی ، مرنے کے بعد بھی ایک المیہ ہی رہے ۔ زمانے کی سفاکی ، جس کے وہ شکوہ سنج تھے ، اس نے مرنے کے بعد بھی انھیں چین سے نہیں رہنے دیا ۔ یہاں تک کہ ان کی آخری آرام گاہ تک کا نام و نشان باقی نہ رکھا ۔

ایک نامور شاعر کے لیے اس سے بڑا المیہ اور کیا ہوسکتا ہے !

نواں باب

صناعِ طرفہ

صناعِ طرفہ ہیں ہم عالم میں ریختے کے
جو میر جی لگے گا تو سب ہنر کریں گے

میر ریختے کے صناعِ طرفہ ہیں ۔ انھوں نے اپنی ساری زندگی ادب اور شعر و شاعری کی دنیا میں بسر کی ہے ۔ وہ اسی کے سہارے جیئے ہیں ۔ انھوں نے شعر کہے ہیں ۔ شاعری کی ہے ۔ ان کی زندگی کا سب سے بڑا سرمایہ یہی ہے ۔ وہ خود اپنے آپ کو شاعر نہیں کہتے ۔ ان کے خیال میں تو جو دیوان انھوں نے بنایا ہے ، وہ تو محض درد و غم کا ایک مجموعہ ہے ۔ اس دیوان میں سے خود بہ قول میر 'جہاں سے دیکھیے ایک شعر شور انگیز نکلتا ہے اور اسی لیے اس میں قیامت کا سا ہنگامہ نظر آتا ہے' ۔ اس میں شک نہیں کہ میر کے دیوان میں ہنگامہ ہے ۔ لیکن اس میں بھی شبہ نہیں کہ اس نے ہنگامہ برپا بھی کیا ہے ۔ اور یہ دیوان ایک نہیں ہے ، تعداد میں چھ عدد ہیں جن میں سے ہر ایک خود بہ قول میر "جادو کی 'پڑی'' کی حیثیت رکھتا ہے ۔ شہروں شہروں اور ملکوں ملکوں ان کی شہرت ہے اور گھر گھر ان کا چرچا ہے ۔

یہ دیوان غزلیات پر مشتمل ہیں ۔ ان میں بہت بڑی تعداد میں غزلیں ہیں ۔ جن کو بہ ترتیب حروف تہجی جمع کیا گیا ہے ۔ ان غزلوں کی تاریخی ترتیب کا تو علم نہیں ۔ کیونکہ میر نے اس کا کہیں ذکر نہیں کیا ۔ البتہ قیاس یہ کہتا ہے کہ جیسے جیسے غزلیں

ہوتی گئی ہیں ، ان کو بہ ترتیب حروف تہجی جمع کیا جاتا رہا ہے ۔ ورنہ تمام دیوانوں میں علیحدہ علیحدہ حروف تہجی کی ترتیب نہ ہوتی ۔ بلکہ ان چھ دیوانوں کی جگہ ایک مکمل دیوان کو ترتیب دیا جاتا اور اس طرح مختلف دیوانوں کی غزلیں حروف تہجی کے اعتبار سے یک جا ہو جاتیں ۔ چھ دیوانوں کو الگ الگ جمع کرنے میں بظاہر کوئی مصلحت نظر نہیں آتی ۔ سوائے اس کے کہ یہ مختلف ادوار میں جمع کیے گئے ہیں اور آخر میں ان سب کو یکجا کر کے ایک مکمل شکل دے دی گئی ہے ۔ ان میں غزلوں کی تعداد ، چونکہ بہت زیادہ ہے ، اس لیے یہ محسوس ہوتا ہے کہ میر نے جتنی غزلیں کہی ہیں ، وہ سب کی سب ان میں موجود ہیں ۔ ان کا کلام ضائع نہیں ہوا ہے ۔ اسی لیے ان دیوانوں میں اچھی غزلیں بھی ہیں اور بری بھی ۔ بلند بھی ہیں اور پست بھی !

لیکن اس کے باوجود یہ ایک حقیقت ہے کہ اِن سب میں میر کی زندگی اور شخصیت کو ان غزلوں میں میر کو سمجھنے کا بڑا سامان ہے !

غزلوں کے علاوہ میر نے قصیدے بھی کہے ہیں ۔ لیکن وہ تعداد میں بہت کم ہیں ، اور ان میں قصیدوں کا سا انداز بھی نہیں ہے ۔ قصیدوں کی جو فنی خصوصیات ہوتی ہیں ، ان سے یہ قصیدے محروم ہیں ۔ بات یہ ہے کہ میر کو قصیدے سے کوئی خاص ذہنی لگاؤ نہیں تھا ۔ اسی لیے انھوں نے اس صنف میں کوئی خاص دلچسپی نہیں لی ہے ۔ بس چند قصیدے کہہ لیے ہیں اور ان میں بھی وہ اہتمام ملحوظ نہیں رکھا ہے جو قصیدہ نگاری کے لیے ضروری ہوتا ہے ۔

اسی لیے قصیدوں کی حیثیت سے اُن کی کوئی خاص اہمیت نہیں ، سوائے اس کے کہ ان میں سے اکثر بزرگانِ دین کے بارے میں ہیں -

البتہ میر نے جو مثنویاں لکھی ہیں ، ان کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا - ہر چند کہ ان مثنویوں میں بھی مثنوی کے فن کی بنیادی خصوصیات نہیں ہیں - لیکن اس کے باوجود ان کی اہمیت اپنی جگہ مُسلّم ہے - کیونکہ یہ مثنویاں شمالی ہندوستان میں مثنوی نگاری کی اولین کامیاب کوشش ہے - میر کی عشقیہ مثنویوں میں خواب و خیال ، شعلۂ عشق ، دریائے عشق ، اعجاز عشق ، معاملات عشق اور ساقی نامہ قابلِ ذکر ہیں - ان مثنویوں میں کہانی کا عنصر بھی موجود ہے اور ساتھ ہی وہ تغزل بھی ہے اور وہ غنائی کیفیت بھی ہے جو میر کے ساتھ مخصوص ہے - ان کے علاوہ میر نے مختلف موضوعات پر کچھ اور مثنویاں بھی لکھی ہیں ، جن میں مثنوی مذمت دنیا ، تسنگ نامہ ، اژدر نامہ ، مذمت برشگال ، ہجو خانۂ خود ، کذب ، شکار نامہ ، مرغ بازاں ، ہولی ، سگ و گربہ وغیرہ خاص طور پر اہم ہیں - یہ مثنویاں اپنے موضوعات کے تنوع اور اندازِ بیان کی سادگی اور بےساختگی کی وجہ سے مثنوی نگاری کی صنف میں ایک اضافے کی حیثیت رکھتی ہیں - بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہے کہ مثنوی کی شکل میں یہ شاعرانہ اعتبار سے نہایت خوبصورت نظمیں ہیں جن سے میر کی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر روشنی پڑتی ہے -

مثنویوں کے ساتھ ساتھ میر کے کلیات میں مخمّس ، مسدّس ، ترکیب بند اور ترجیع بند بھی ملتے ہیں - ان میں سے بیشتر میں انھوں نے اپنے معتقدات کا بیان کیا ہے - ایک ہفت بند ، ایک ترجیع بند ، دس مخمس ، تین مسدس منقبت میں کہے ہیں - ایک

مسدس کا موضوع نعت ہے ۔ تین مخمس ایسے ہیں جن میں دوسرے شعرا کی غزلوں کی تضمین کی گئی ہے ۔ چند مثلث میں تضمینیں ہیں ۔ ان کے علاوہ چار مخمس ہجویات کے ہیں اور دو ترکیب بند عاشقانہ ہیں ۔

اُردو میں میر نے اس کے علاوہ اور کچھ نہیں کہا ۔ ان تمام اصناف یعنی غزل ، قصیدہ ، مثنوی ، رباعی ، ترکیب بند ، ترجیع بند ، مُخمّس ، مُسدّس ، سب کو یک جا کیا جائے تو میر کا ضخیم کلیات بنتا ہے ، جو اُردو میں ایک اہم شعری مجموعے کی حیثیت رکھتا ہے ۔

کلیات کے علاوہ میر کے مراثی کا ایک مجموعہ بھی ہے ، جس کا ایک نسخہ پروفیسر سید مسعود حسن صاحب رضوی ادیب مرحوم کے کتب خانے میں موجود ہے ۔ ان مراثی کو مسیح الزماں صاحب نے مرتب کر کے الہ آباد سے شائع کر دیا ہے ، اور یہ مرثیے راقم الحروف کے مرتب کیے ہوئے 'کلیاتِ میر' میں بھی شامل ہیں ۔

میر نے اردو کے ساتھ ساتھ فارسی میں بھی شاعری کی ہے اور ایک دیوان فارسی بھی مرتب کیا ہے ۔ مصحفی نے لکھا ہے :

"دعوئے شعر فارسی چنداں نہ دارد ۔ اگرچہ فارسی کم از ریختہ نمی گوید ۔ می گفت کہ دو سال شغل ریختہ موقوف کردہ بودم دراں ایام قریب دو ہزار بیت فارسی صورت تدوین یافتہ [۱] ۔"

میر کا فارسی دیوان مطبوعہ نہیں ہے ۔ ویسے اس کے کئی قلمی نسخے مختلف کتب خانوں میں موجود ہیں ۔ ایک قلمی نسخہ پروفیسر

---

۱ ۔ مصحفی : عقدِ ثریا ، ص ۵۳ ۔

سید مسعود حسن صاحب رضوی ادیب مرحوم کے کتب خانے میں ہے - یہ نسخہ دو سو صفحات پر مشتمل ہے - دوسرا نادر نسخہ ادارۂ ادبیات اردو حیدر آباد دکن کے کتب خانے میں ہے - یہ نسخہ ۱۱۹۲ھ کا لکھا ہوا ہے - اس کا لکھنے والا دولت رائے کاتب ہے اور اس میں کل ۸۸ صفحات ہیں - ایک اور اہم نسخہ کتب خانۂ آصفیہ میں ہے - اس کی کتابت ۱۲۱۴ھ کی ہے اور اللہ رکھا نامی کاتب نے اس کو لکھا ہے - اس کے علاوہ فارسی دیوان کا ایک نسخہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں بھی ہے - میر کے فارسی کلام پر سب سے پہلے حضرت عزیز لکھنوی نے ایک مبسوط مقالہ رسالہ نیرنگ رام پور کے میر نمبر میں لکھا - پھر اس کے بعد ایک مقالہ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی صاحب نے رسالہ "مصنف" میں شائع کیا - لندن کے دوران قیام میں برٹش میوزیم میں بھی 'کلیات میر' کا نسخہ آشفتہ میری نظر سے گزرا ہے جس میں میر کا مکمل فارسی دیوان موجود ہے - میر کے فارسی دیوان کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ فارسی پر بھی انھیں قدرت حاصل ہے ، اور اس زبان میں بھی انھوں نے اعلیٰ درجے کی غزلیں کہی ہیں -

شعرائے اردو کا ایک تذکرہ بھی میر نے لکھا ہے - جو "نکات الشعرا" کے نام سے مشہور ہے - یہ اردو شعرا کے اولین تذکروں میں سے ہے - "اس وقت تک جتنے تذکرے دستیاب ہوئے ہیں ، ان میں "نکات الشعرا" کو تقدم حاصل ہے - میر کے علاوہ بعض اور تذکرہ نویس بھی اس بات کے مدعی ہیں کہ سب سے پہلے ریختہ گو شعرا کا تذکرہ انھوں نے لکھا ہے - مثلاً قائم جس کے تذکرے کا سنہ تالیف ۱۱۶۸ھ ہے یا خاکسار ، جس نے ۱۱۶۵ھ میں "معشوق

چہل سالہ خود" کے نام سے ایک تذکرہ لکھا ۔ گارساں دی تاسی
نے غلطی سے یہ خیال کر لیا ہے کہ گردیزی کو بھی یہ دعویٰ
ہے کہ اس کا تذکرہ سب سے پہلا ہے ۔ حالانکہ اس نے کہیں ایسا
دعویٰ نہیں کیا اور اپنے دیباچے میں ان تذکروں کی ناانصافی اور
کم تحقیقی کی شکایت کی ہے ، جو اس سے قبل لکھے گئے ہیں ۔ یہ
کہنا صحیح ہوگا کہ اس نے اپنا تذکرہ میر ہی کے جواب میں لکھا
ہے ۔ خاکسار کے تذکرے کے متعلق میر فرماتے ہیں کہ ''علی الرغم
ایں تذکرہ نوشتہ است بنام معشوق چہل سالہؔ خود ۔ احوال خود
را اول از ہمہ نگاشتہ و خطاب خود سید الشعرا پیش خود قرارداده''
اس کی حقیقت ان چند سطروں سے ظاہر ہے ۔ تذکرہ گردیزی کا سنہ
تالیف ۱۱۶۶ھ اور قائم کا ۱۱۶۸ھ ہے ۔ ''میر نے اپنے تذکرے کے
سن تالیف کے متعلق کہیں کوئی صراحت نہیں کی ۔ البتہ انند رام
مخلص کے حال میں یہ فقرہ ان کے قلم سے ایسا نکل گیا ہے جس سے
اس کی نسبت قیاس کیا جا سکتا ہے ۔ وہ لکھتے ہیں : ''قریب یک
سال است کہ در گزشت'' یعنی جس وقت یہ تذکرہ زیرِ تالیف تھا ۔
اس وقت مخلص کو مرے ایک سال ہوا تھا ۔ مخلص کا سن وفات
۱۱۶۴ھ ہے ۔ لہٰذا یہ قیاس بجا ہے کہ اس کا سن تالیف ۱۱۶۵ھ ہے
اور چونکہ گردیزی نے اپنا تذکرہ میر صاحب ہی کے جواب میں
لکھا ہے جس کے متعلق میں 'تذکرہ ریختہ گویاں' مؤلفہ گردیزی کے
مقدمے میں مفصل بحث کر چکا ہوں ، اس لیے اس سنہ کی صحت کی
پوری تصدیق ہو جاتی ہے ۔ البتہ اس سنہ میں دو تذکرے اور تالیف
ہوئے تھے ، ایک 'تحفۃ الشعرا' مؤلفہ افضل بیگ قاقشال اورنگ آبادی
اور دوسرا 'گلشن گفتار' مؤلفہ خواجہ خان حمید اورنگ آبادی ۔ لیکن

ان کا علم میر صاحب کو مطلق نہیں تھا - بلکہ میر صاحب کے بعد بھی جس قدر مشہور تذکرہ نویس ہوئے ہیں مثلاً قائم ، میر حسن ، مصحفی ، قاسم ، شوق وغیرہ ، وہ سب ان سے لاعلم تھے - چند تذکرے میر صاحب سے قبل بھی لکھے گئے تھے - مثلاً 'تذکرۂ سید امام الدین' بہ عہد محمد شاہ ، جس کا حوالہ میر حسن نے اپنے تذکرے میں دیا ہے - 'تذکرۂ خان' آرزو ، مگر یہ تذکرہ فارسی شعرا کا ہے - تذکرۂ سودا ، اس کا حوالہ دو جگہ قدرت اللہ قاسم نے اپنے تذکرے 'مجموعہ نغز' میں دیا ہے - لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اسے کچھ غلط فہمی ہوئی ہے - غالباً وہ قائم کے تذکرے کو سودا کا سمجھا ہے - بہرحال میر صاحب کے سامنے ان میں سے کوئی تذکرہ نہ تھا اور نہ اب تک یہ دستیاب ہوئے ہیں''[۱] - بہرحال میر کا تذکرہ اس اعتبار سے بہت اہم ہے کہ اردو شعراء کے تذکروں میں سب سے پہلے لکھا گیا ہے اور اس طرح اُس نے اُردو میں تذکرہ نویسی کی داغ بیل ڈالی ہے -

'نکات الشعرا' میں اس وقت کے معروف اور غیرمعروف شاعروں کا حال ، اُن کی شخصیت کا بیان اور ان کے کلام کا انتخاب اور اس پر رائے کا اظہار ہے - میر نے دوسرے تذکرہ نویسوں کی طرح ان سب کے بیان میں اختصار سے کام لیا ہے - لیکن اس اختصار میں خاصی جامعیت اور ہمہ گیری ہے - میر جس شاعر کے بارے میں جتنی بات کہنی چاہتے ہیں وہ انھوں نے بڑی خوبی سے کہہ دی ہے - ان کا مقصد شاعروں کا مختصر تعارف ہے - اس تعارف کے خیال سے

---

۱ - ڈاکٹر عبدالحق : مقدمہ تذکرۂ نکات الشعرا ، ص ۲

انھوں نے چند سطریں ہر شاعر کے بارے میں لکھی ہیں ۔ ان سطروں سے یہ تعارف مکمل ہو جاتا ہے ۔ کیونکہ ان سطروں کو پڑھنے کے بعد اس شاعر کی شخصیت کی تصویر خود بخود آنکھوں کے سامنے آ جاتی ہے اور اس بات کا اندازہ ہو جاتا ہے کہ وہ کیسا آدمی اور کس طرح کا شاعر ہے ۔ میر کے ان جملوں میں بڑا ہی چونکا دینے والا انداز ہے جو اپنی طرف متوجہ کرتا ہے ۔ مثلاً حضرت امیر خسروؒ کے بارے میں ان کا یہ کہنا کہ ''مجمع کمالات و صاحب حالات فضائلِ او اظہر من الشمس است" ۔ اگرچہ مختصر ہے لیکن ان کی شخصیت کو ہمارے سامنے ضرور پیش کردیتا ہے ۔ سراج الدین علی خانِ آرزو کے متعلق یہ فقرے : ''آب و رنگ باغ نکتہ دانی ، چمن آرائے گلزار معانی ، متصرف ملک زور طلب بلاغت ، پہلوانِ شاعر عرصۂ فصاحت ، چراغ دودمان صفائے گفتگو کہ چراغش روشن باد'' اس حقیقت کو ضرور واضح کر دیتے ہیں کہ خانِ آرزو کی حیثیت ادب و شعر کی دنیا میں کیا تھی ۔ میرزا مظہر جان جاناں کے بارے میں ان کا یہ لکھنا کہ ''مردے است مقدس ، مطہّر ، درویش ، عالم ، صاحب کمال ، شہرۂ عالم بے نظیر ، معزز ، مکرم" اس سے ظاہر ہے کہ فوراً ایک ایسے شخص کی تصویر ہمارے سامنے پیش کردیتا ہے جو تقدس ، پاکیزگی اور علم میں اپنا جواب نہیں رکھتا ۔ میاں مضمون کے بارے میں ان کے یہ الفاظ ''حریف ، ظریف ، ہشّاش ، بشّاش ، ہنگامہ گرم کن مجلسہا'' اس بات کو واضح کر دیتے ہیں کہ وہ کیسے دلچسپ اور بزم آرا آدمی تھے ۔ اسی طرح مرزا رفیع سودا کے متعلق صرف یہ لکھنا کہ ''جوانے است خوش خلق ، خوش خوئے ، گرم جوش ، یار باش ، شگفتہ روئے ۔" ان کی نشاطیہ طبیعت کو واضح

کر دینے کے لیے کافی ہے اور درد کے بارے میں یہ جملے ''جوش بہارِ گلستان سخن ، عندلیب خوش خوان چمن ایں فن ، زبانِ گفتگویش گرہ کشائے زلفِ شام مدعا ۔ مصرع نوشتہاش بر کاغذ از کاکل صبح خوش نما صبح سخن پرواز او سرو مائل چمنستان انداز است ۔ گاہے در کوچۂ باغ تلاش بہ طریق گل گشت قدم رنجہ می فرماید ۔ در چمن شعرش لفظ رنگین چمن چمن ، گل چیں خیال او گل معنی دامن دامن ، شاعر زور آور ریختہ در کمال علاقگی وارستہ ، خلیق ، متواضع ، آشنائے درست ۔'' ان کی اہم شخصیت کی مکمل تصویر ہمارے سامنے پیش کر دیتے ہیں ۔ غرض ہر شاعر کو انہوں نے کچھ اسی انداز سے پیش کرنے کی کوشش کی ہے ، اور ان کا انداز پوری طرح کامیاب ہے ۔ کیونکہ ان کی تحریر سے ہر شاعر کی شخصیت کا صحیح تعارف ہو جاتا ہے ۔ میر نے ایسا کر کے دریا کو کوزے میں بند کر دیا ہے ۔ اس اندازِ بیان میں فارسی کی روایتی نثر کا مسجع اور مقفیٰ اسلوب ضرور ہے ۔ رنگینی اور پرکاری بھی کہیں کہیں موجود ہے لیکن میر نے اس کو کسی مقصد سے استعمال کیا ہے ۔ وہ صرف الفاظ کی بازی گری نہیں ہے ، بلکہ اس میں گہری معنویت ہے ۔ اوریہی ان کی شخصیت نگاری کی جان ہے ، اور یہ شخصیت نگاری ان کے تذکرے 'نکات الشعرا' کا ایک اہم پہلو ہے ۔

میر کے اس تذکرے کی ایک اور اہم خصوصیت اس کی تنقید ہے ۔ انہوں نے اس میں گہرے تنقیدی شعور کا اظہار کیا ہے ۔ اس تنقیدی شعور کا احساس وہاں ہوتا ہے جہاں شاعروں کے کلام پر رائے دی گئی ہے ۔ میر کی رائیں بڑی ہی جچی تلی اور حقیقت پر مبنی ہیں ۔ ان میں اختصار کے ساتھ ہمہ گیری بھی ہے ۔ ان آرا سے پتہ

چلتا ہے کہ میر کے پاس شعر و ادب کو جانچنے اور پرکھنے کے بعض معیار بھی ہیں - انھیں معیاروں اور اصولوں کی روشنی میں وہ اظہارِ خیال کرتے ہیں - اسی لیے ان کی بات بے بنیاد نہیں ہوتی - بلکہ اس میں گہرائی کا احساس ہوتا ہے اور توازن کی خصوصیت نظر آتی ہے - سودا کے بارے میں ان کا یہ اظہارِ خیال کہ ''غزل و قصیدہ و مثنوی و قطعہ و مخمس و رباعی ہمہ را خوب می گوید - سرآمد شعرائے ہندی اوست - بسیار خوش گو است بلا گرداں ہر شعرش طرف لطف رستہ رستہ ، در چمن بندی الفاظش گل معنی دستہ دستہ - ہر مصرعہ برجستہ اش را سرو آزاد بندہ ، پیش فکر عالیش طبع عالی شرمندہ - شاعر ریختہ - چنانچہ ملک الشعرائی ریختہ او را شاید -'' اور تاباں کے متعلق یہ رائے کہ ''ہر چند عرصہ سخن او ہمیں در لفظہائے گل و بلبل تمام است اما بہ رنگیں می گفت'' یا میر سجاد کے کلام کے متعلق یہ خیال کہ ''چنیں خوش گو و معنی یاب اگرچہ در بند لفظ تازہ است لیکن بر زبان خامہ او خیلہائے معنی سیاہی می کند'' - ان کے تنقیدی شعور کو واضح کرنے کے لیے کافی ہے - کم و بیش تمام شاعروں پر انھوں نے اسی انداز میں تنقیدی رائیں دی ہیں ، اور یہ رائیں تنقیدی اعتبار سے خاصی اہم ہیں - البتہ کہیں کہیں دو ایک شاعروں کے بارے میں میر نے ایسے خیالات کا اظہار بھی کر دیا ہے ، جن میں حقیقت کا شائبہ بھی نہیں - لیکن اس کا سبب ادبی یا فنی معیار نہیں بلکہ ذاتی پسند یا ناپسند ہے - میر کی یہی ایک کمزوری تھی - بہرحال یہ خامی میر کے یہاں موجود ہے - لیکن اس سے ان کے تنقیدی شعور کی نفی نہیں ہوتی - جہاں جہاں انھوں نے اس سے کام لیا ہے ، وہاں 'نکات الشعرا' میں اعلیٰ درجے

کی تنقید پیدا ہوئی ہے ، اور اس تنقید کی وجہ سے اس کا مرتبہ بہت بلند ہوگیا ہے -

'نکات الشعرا' ان سب باتوں کے علاوہ خود میر کی شخصیت کا بھی ایک حسین مرقع ہے - اس زمانے کا شاعرانہ ماحول کیسا تھا اور اس سے وہ کیا تعلق رکھتے تھے ؟ مختلف شعرا سے ان کے تعلقات کی نوعیت کیا تھی ؟ وہ ان سے کس طرح ملتے جلتے تھے ؟ انھوں جو شاعرانہ فضا قائم کی تھی اس میں خود میر کی کیا حیثیت تھی ؟ وہ کن محفلوں میں شریک ہوتے تھے ؟ ان کا وقت کس طرح گزرتا تھا ؟ وہ کن شاعروں کو برا سمجھتے تھے اور کیوں برا سمجھتے تھے ؟ اُن کے مزاج میں کیسی شگفتگی تھی ؟ کس طرح وہ شاعروں پر فقرے چست کر دیتے تھے ؟ کس طرح ان میں سے بعض کے ساتھ اچھا وقت گزارتے تھے ؟ کس طرح شطرنج کھیلتے اور گپ کرتے تھے ؟ شعر و شاعری کی کون سی محفلیں منعقد ہوتی تھیں اور میر ان میں کس طرح شرکت کرتے تھے ؟ ان کا وقت کس طرح ہنسی مذاق میں گزرتا تھا ؟ کن لوگوں سے انھیں دلچسپی تھی اور کون سے لوگ ایسے تھے جن سے وہ نفرت کرتے تھے ؟ انھیں کون سی باتیں پسند تھیں اور کن باتوں کو وہ ناپسند کرتے تھے ؟ زندگی اور فن کے کون سے اصول تھے جن سے انھیں لگاؤ تھا ؟ غرض اس طرح کی بےشمار باتیں اس تذکرے میں ہیں اور ان باتوں سے میر کی شخصیت کے خد و خال نمایاں ہوتے ہیں اور ان کے ذہنی میلانات کا پتہ چلتا ہے -

میر کی تصانیف میں اسی لیے 'نکات الشعرا' کو ایک نمایاں مقام حاصل ہے -

'ذکرِ میر'، میر کی اور اہم تصنیف ہے۔ اس کتاب میں میر نے اپنی زندگی کے حالات لکھے ہیں۔ میر کو سمجھنے اور ان کی شخصیت سے اپنے آپ کو آشنا کرنے میں یہ کتاب بڑی مدد دیتی ہے۔ ان کی شخصیت اور کردار، افکار و خیالات اور ذہنی میلانات کا اس سے بخوبی اندازہ ہوتا ہے اور اس زمانے کے سیاسی، معاشرتی اور تمدنی حالات پر بھی اس سے خاصی روشنی پڑتی ہے۔ اس کی تالیف کا سبب انھوں نے خود اس کتاب کے شروع میں بیان کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

''می گوید فقیر میر محمد تقی المتخلص بہ میر کہ درین ایام بیکار بودم، در گوشۂ تنہائی بے یار۔ احوال خود را متضمن حالات و سوانح روزگار و حکایت و نقلہا نگاشتم و بنائے خاتمہ این نسخۂ موسوم بہ ذکرِ میر برلطائف گزاشتم۔''

اور اس میں شک نہیں کہ اس کتاب میں ان باتوں کی خاصی تفصیل موجود ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ میر نے اپنے نجی حالات کو بیان کرتے ہوئے اس زمانے کے ماحول کا بہت ہی تفصیل سے تذکرہ کیا ہے۔ اس میں میر نے اپنے بزرگوں کا حال بیان کیا ہے اور اس بات کی وضاحت کی ہے کہ وہ کس طرح ہندوستان آئے اور یہاں انھیں کن حالات سے دوچار ہونا پڑا؟ پھر اپنے والد کی شخصیت پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے اور ان کی سیرت اور نصائح کا بیان کیا ہے۔ اس کے بعد سید امان اللہ کے حالات بیان کیے ہیں جو ان کے والد کے مرید ہو جاتے ہیں اور جن کے زیرِ سایہ میر کی تربیت ہوتی ہے۔ میر نے اس کے بعد اپنے والد میر علی متقی اور اپنے منہ بولے چچا سید امان اللہ کی وفات کا ذکر کیا ہے اور اس بات کی وضاحت کی ہے کہ ان کی وفات کے بعد ان پر کیا گزری؟ وہ کس

طرح پریشان رہے ؟ عرصۂ حیات ان پر تنگ ہوگیا اور مجبوراً انہیں اکبر آباد چھوڑ کر دلی جانا پڑا جہاں وہ تلاش معاش میں سرگرداں پھرتے رہے ۔ بڑی مشکل سے صمصام الدولہ امیر الامرا کے دربار میں جانے کی ایک صورت نکلی اور وہاں سے روزینہ مقرر ہوا ۔ لیکن چند مہینے ہی گزرے تھے کہ نادر شاہ کا حملہ ہوا اور صمصام الدولہ مارے گئے ۔ چنانچہ وہ روزینہ بند ہوگیا ۔ اس کے بعد میر کو جن ناسازگار حالات سے دوچار ہونا پڑا ، اپنوں کی بےوفائی اور زمانے کی ستم کاری کے ہاتھوں ان پر جو کچھ گزری ، اس کا مفصل بیان انھوں نے کیا ہے ۔ شاید اس زمانے کے سیاسی حالات کی اتنی تفصیل اس وقت کی کسی اور کتاب میں نہیں مل سکتی ۔ میر نے ان ہنگاموں میں جس طرح زیست کرنے کی کوشش کی ہے اور جو ملازمتیں کی ہیں ، جہاں جہاں وہ گئے ہیں ، جن حالات کا انھیں سامنا کرنا پڑا ہے ، ان کو بڑی وضاحت سے پیش کیا ہے اور پھر میر نے یہ لکھا ہے کہ جب ان حالات نے زیست دشوار کر دی اور پانی سر سے اونچا ہوگیا تو دلی انھیں چھوڑنی پڑی اور وہ لکھنؤ پہنچے ، جہاں انھوں نے اپنی زندگی کے آخری ایام کسی قدر اطمینان سے گزارے ۔

'ذکر میر' کا لطف حالات و واقعات کی مصورانہ تفصیل ، ذہنی و جذباتی میلانات کی فن کارانہ ترجمانی اور معاشرتی و تہذیبی معاملات کی عکاسی میں ہے ، اور اس طرح میر کی شخصیت ، ان کے افکار و خیالات اور ذہنی و جذباتی میلانات کی تصویر کو یہ کتاب بڑی خوبی سے پیش کرتی ہے ۔

یہ ایک نادر الوجود کتاب تھی ، لیکن ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب نے اس کو انجمن ترقی اردو سے شائع کر کے عام کردیا ۔

۱۹۳۵ء میں یہ کتاب اورنگ آباد سے شائع ہوئی -

'ذکرِ میر' کے علاوہ میر نے ایک اور کتاب 'فیضِ میر' کے نام سے لکھی ہے - یہ کتاب اس لحاظ سے بہت دلچسپ ہے کہ اس سے میر کے مذہبی معتقدات اور عقائد و توہمات کا علم ہوتا ہے ' اور زندگی میں ان کی عجیب و غریب دلچسپیوں کی تفصیل معلوم ہوتی ہے - میر کی شخصیت کو سمجھنے میں اس کتاب کی بھی خاصی اہمیت ہے - ویسے اس کتاب کو کتاب بہ مشکل ہی کہا جا سکتا ہے - کیونکہ یہ تو بہرحال ایک مختصر سا رسالہ ہے - جس میں چند درویشوں کی حکایتیں بیان کی گئی ہیں - ان کو تالیف کر کے کتابی صورت دینے کا سبب میر نے خود بیان کیا ہے - لکھتے ہیں :

''می گوید فقیر حقیر میر تقی متخلص بہ میر کہ دریں ایام فیض علی پسر من ذوق خواندن ترسل پیدا کردہ بود - حکایات خمسہ متضمن فوائد بسیار اندک فرصت نگاشتم و مراعات اسم او نمودہ نام نسخہ فیض میر گزاشتم[۱] -''

'فیض میر' پانچ حکایتوں پر مشتمل ہے - ''ان حکایتوں میں میر نے اللہ والوں کے حالات اور پیروں کی کرامات بیان کی ہیں اور جو کچھ لکھا ہے وہ سنی سنائی نہیں ، آنکھوں دیکھی باتیں ہیں - یہ واقعات ہوں یا میر صاحب کی خوش اعتقادی کے کرشمے ، بہرحال ان کی روشنی میں میر صاحب کی ذہنیت صاف نظر آتی ہے ، اور واضح ہو جاتا ہے کہ میر صاحب ایک فقیر منش بزرگ تھے -

---

۱ - فیض میر ، ص ۱

صوفیوں اور درویشوں سے بڑی عقیدت رکھتے تھے - ان کی خدمت کو اپنی عزت اور ان کی دل جوئی کو فرض انسانیت سمجھتے تھے - ان کو خدا رسیدہ جانتے اور صاحبِ کرامت مانتے تھے - تصوف اور الٰہیات کے مسائل سے بڑی دلچسپی تھی - ان کو غور سے سنتے تھے اور سمجھنے اور یاد رکھنے کی کوشش کرتے تھے - جس کی تربیت میر علی متقی اور میر امان اللہ کی گود میں ہوئی ہو ، اس کی طبعیت کا انداز اور کیا ہوتا،، -۱

'فیض میر' بھی 'ذکرِ میر' کی طرح عرصے تک نایاب رہی - آزاد نے 'آبِ حیات' میں اس رسالے کا ذکر کیا تھا - لیکن عرصے تک اس کا پتہ نہ چلا - بالآخر پروفیسر سید مسعود حسن صاحب رضوی ادیب کو اس کا ایک قلمی نسخہ مل گیا اور انھوں نے اس کو مرتب کر کے مع مقدمے اور اردو ترجمے کے نومبر ۱۹۲۹ع میں نظامی پریس لکھنؤ میں چھپوا کر شائع کر دیا -

یہ تصانیف میر کی زندگی کا سرمایہ ہیں - انھیں کے سہارے انھوں نے زندگی بسر کی ہے - ان کی زندگی کا سارا وقت انھیں کو بنانے سنوارنے میں گزرا ہے - اگر ان کے یہ مشاغل نہ ہوتے تو ان کے لیے زیست کرنی مشکل ہو جاتی اور زندگی کی تاریک رات ان سے کاٹے نہ کٹتی - حقیقت یہ ہے کہ ان تخلیقی مشاغل ہی نے انھیں زندہ رکھا ہے اور جن کا مظہر یہ تصانیف ہیں -

اگرچہ میر کی یہ تمام تصانیف اپنی اپنی جگہ اہم ہیں ، ان میں سے ہر ایک ان کی تخلیقی صلاحیتوں کی آئینہ داری کرتی ہے - لیکن

---

۱ - پروفیسر سید مسعود حسن رضوی ادیب : مقدمہ فیض میر ، ص ۸

اس میں شک نہیں کہ بنیادی طور پر وہ ایک شاعر ہیں اور ان کے تخلیقی جوہر اسی صنف ادب میں کھلتے ہیں ۔ ساری زندگی انہیں اسی سے دلچسپی رہی ہے ۔ اسی کے سہارے وہ زندہ رہے ہیں اور یہی آن کی زندگی کا ماحصل بھی ہے ۔ اسی لیے ان کی شعری تصانیف آن کی زندگی میں سب سے زیادہ اہمیت رکھتی ہیں اور آن کو دیکھ کر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اپنے زمانے میں میر نے شاعری کو ، اور شاعری نے میر کو زندہ رکھا ہے ، اور انہیں ریختے کا صناعِ طرفہ بنا دیا ہے ، جس پر وہ زندگی بھر فخر کرتے رہے ہیں ۔ لیکن اس حقیقت کو بھی بھلایا نہیں جا سکتا کہ وہ فارسی نثر کے بھی صناعِ طرفہ ہیں ۔ آن کی فارسی نثرنگاری پکار پکار کر اس حقیقت کا اظہار کرتی ہے کہ وہ صرف ریختے ہی کے صناعِ طرفہ نہیں ، فارسی نثر کے بھی ایک منفرد فن کار ہیں ۔

دسواں باب

میر ستم کشتہ

میر کے حالات زندگی سے پتہ چلتا ہے کہ وہ نسلاً ایک اعلیٰ خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کی شرافت و نجابت مسلّم ہے۔ ان کی رگوں میں عرب خون تھا۔ اس لیے اس کی بنیادی خصوصیات کا عکس ان کی شخصیت میں بھی نظر آتا ہے۔ میر کے مزاج میں جو گرمی ہے، ان کی طبیعت میں جو شدت اور انتہائی پسندی ہے، وہ در حقیقت ان کی اسلی خصوصیت کا عکس ہے۔ حمیت اور غیرت جو ان کے یہاں سب سے زیادہ نمایاں ہے، اس کے پیچھے بھی ان کی نسلی خصوصیت کا ہاتھ کارفرما نظر آتا ہے۔ میر کے یہاں جو نیکی اور شرافت ہے، ان کے کردار میں وہ جو ایک استواری اور ثابت قدمی ہے اور بلندی اور بلند آہنگی، ایثار اور قربانی، وفار اور سپردگی کی جو خصوصیات ہیں، وہ سب کی سب بڑی حد تک ان کی نسلی خصوصیات کی آئینہ دار ہیں۔

اس میں شبہ نہیں کہ نسلی طور پر میر ایک بلند مقام رکھتے ہیں، اور اس میں بھی کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں کہ ان کی شخصیت میں قدم قدم پر اس کے اثرات ملتے ہیں۔ لیکن میر کے خاندان کو جن ناسازگار حالات سے دو چار ہونا پڑا، اس کے اثرات بھی ان پر کچھ کم گہرے نہیں ہیں۔ میر نے خود لکھا ہے کہ ان کے خاندان کو بڑی بڑی پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑا۔ عسرت اور زبوں حالی ہمیشہ ان کے آبا و اجداد کے ساتھ رہی۔ اگر ایسا

نہ ہوتا تو ان کے خاندان والے اپنے وطن ہی کو کیوں خیرباد کہتے !
انھوں نے اپنے وطن کو چھوڑ کر ہندوستان میں جو اقامت اختیار
کی ، اس کا سبب یہی ہے کہ انھیں وہاں اطمینان نصیب نہیں تھا ۔
وہ ہندوستان آنے کو تو آ گئے لیکن ان کے خاندان کے جو حالات
ہم تک پہنچے ہیں ، ان سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ یہاں بھی وہ
خوش نہ رہے ۔ اِفلاس ہمیشہ ان کے ساتھ رہا ۔ کبھی ذرا سنبھلے
بھی تو کسی ناگہانی مصیبت نے آ لیا ، اور جو کچھ وہ کرنا چاہتے
تھے ، نہ کر سکے ۔ نتیجہ یہ ہوا کہ تقریباً سب نے عسرت اور
پریشانی میں زندگی بسر کی ۔ وقت کے ساتھ ساتھ ان کے خاندان کے حالات
بد سے بدتر ہوتے گئے ۔

میر نے آنکھ کھول کر دیکھا تو انھیں اپنے خاندان میں دور
دور تک پریشانی اور زبوں حالی نظر آئی ۔ عسرت اور افلاس کا دور
دورہ دکھائی دیا ۔ میر کا اس سے متاثر ہونا لازمی تھا ۔ وہ اس
صورتِ حال سے متاثر ہوتے ہیں اور ان کی شخصیت میں زندگی سے
علاحدگی اور اس کی رونقوں سے ایک طرح کی بیزاری کا جو احساس
ملتا ہے ، وہ بڑی حد تک اسی کا نتیجہ ہے ۔ یہ حقیقت ہے کہ میر
نے ساری زندگی اپنی دنیا الگ بنانے کی کوشش کی ہے ۔ وہ اپنے آپ
میں گم ہو گئے ہیں ۔ انھوں نے اپنے آپ سے باہر نکل کر بہت ہی
کم دیکھا ہے ۔ انھیں ہر چیز پر اداسی اور سوگواری برستی نظر
آتی ہے ۔ اس لیے کہ انھوں نے خود جو کچھ اپنے نجی اور خاندانی
ماحول میں دیکھا ، اس میں سوائے ان باتوں کے اور کچھ نہیں تھا ۔
اس لیے میر زندگی کے بارے میں اس طرح سوچنے کے لیے مجبور تھے ۔
اس کے برخلاف سوچنا ان کے بس کی بات نہیں تھی ۔ میر کی شخصیت

میں شگفتگی کا فقدان ہے جو بظاہر بہت عجیب معلوم ہوتا ہے ۔ لیکن ان کے خاندانی حالات کی زبوں حالی کو سامنے رکھا جائے تو اس کی اصل حقیقت پوری طرح واضح ہو جاتی ہے اور وہ عجیب معلوم ہونے کے بجائے میر کی شخصیت کا ایک فطری پہلو نظر آنے لگتا ہے ۔

وہ تو کہیے کہ میر اور میر کے خاندان کے افراد کو درویشی کی روایت کا سہارا مل گیا ورنہ زندگی میں جن حالات سے انہیں سابقہ رہا ، ان میں زیست ممکن نہیں تھی ۔ اس درویشی نے میر کے بزرگوں کو اپنی ذات میں مگن رہنا سکھایا ۔ توکل اور قناعت کی اہمیت ذہن نشین کرائی ، مادیت سے چشم پوشی کا درس دیا ، روحانیت کے تصورات عام کیے ۔ زندگی کے اعلیٰ معیاروں کا احساس دلایا ، ارفع قدروں کی طرف توجہ مبذول کرائی ، حیات و کائنات کی بے ثباتی کا خیال پیدا کیا ، جذب و شوق کو ان کا نصب العین بنایا ۔ میر کی شخصیت میں یہ تمام باتیں موجود ہیں ۔ ان کی درویشی اور قلندری میں بھلا کس کو شبہ ہو سکتا ہے ؟ یہ درویشی اور قلندری ان تک اپنے بزرگوں کے توسّط سے پہنچی ہے ، خاص طور پر ان کے والد میر علی متقی ـــ اور منہ بولے چچا ـــ میر امان اللہ کی شخصیتوں کا اس میں بڑا ہاتھ ہے ـــ ان دونوں کے گہرے اثرات ہی نے میر صاحب کو ایک درویش اور قلندر بنایا ہے ، اور وہ تمام خصوصیات ان کی شخصیت میں پیدا کر دی ہیں ، جنھوں نے انہیں زندگی کے ایک مخصوص تصور سے آشنا کیا ہے ۔

میر کی شخصیت میں تصوف کے اثرات بھی بڑے گہرے ہیں یہ تصوف انہیں ورثے میں ملا ہے اور اس نے انہیں زندگی کو ایک

مخصوص زاویے سے بسر کرنا سکھایا ہے ۔ میر زندگی کے مادی پہلوؤں سے بڑی حد تک بے نیاز نظر آتے ہیں ۔ انھیں اپنے آس پاس اور گرد و پیش سے ایسی کچھ زیادہ دلچسپی نہیں معلوم ہوتی ۔ برخلاف اس کے وہ اپنی ذات سے زیادہ سروکار رکھتے ہیں ۔ یہی وجہ ہے کہ زندگی میں وہ جس مسئلے سے بھی دو چار ہوئے ہیں ، اس کو انھوں نے ذاتی اور انفرادی زاویۂ نظر سے دیکھا ہے اور ان کے یہاں جو بے اندازہ داخلیت نظر آتی ہے ، اس کا بنیادی سبب بھی یہی ہے ۔ میر کو تصوف کے توسط سے زندگی کے اعلیٰ معیار بھی ملے ہیں ۔ اس لیے وہ کسی جگہ بھی اپنی سطح سے نیچے نہیں گرتے ۔ زندگی کا ایک معیار ہمیشہ ان کے پیشِ نظر رہا ہے ۔ اخلاق کے بعض اصول ہر حال میں ان کے سامنے رہے ہیں ۔ انھوں نے کبھی کسی کی پروا نہیں کی ، جو کچھ محسوس کیا اور سوچا ، اس کا بے باکی کے ساتھ اظہار کیا ہے ۔ اس اظہار میں چونکہ بے ساختگی اور برجستگی زیادہ ہے ، اس لیے میر کے طرزِ عمل میں ہر جگہ ایک سادگی کا احساس ہوتا ہے ، اور ایک فطری کیفیت نظر آتی ہے ۔ تصوف سے گہرے لگاؤ نے میر کے یہاں احساس کی شدت کو بڑھایا ہے ۔ اسی کے اثر سے وہ زندگی بھر حد درجہ جذباتی رہے ہیں ۔ محسوسات کے دائرے سے نکل کر انھوں نے زندگی میں بہت کم کوئی کام کیا ہے ۔ کبھی کبھی ایسا ہوا ہے کہ وہ اپنی ذات سے باہر نکلے ہیں تو انھوں نے اس تصوف کے زیر اثر حیات و کائنات کے بعض بنیادی معاملات و مسائل سے دل چسپی کا اظہار کیا ہے ۔ لیکن ان کے اظہار میں بھی ان کا انداز جذباتی اور محسوساتی رہا ہے ۔ اس لیے وہ فلسفیانہ باتیں کرنے کے باوجود کبھی فلسفی نہ بن سکے ۔

ویسے فلسفیانہ معاملات و مسائل سے انہوں نے دلچسپی کا اظہار ضرور کیا ہے ۔ لیکن ان سب کا محور ایک ہی ہے ۔ یعنی ذات الٰہی اور معرفت الٰہی ۔ میر نے اپنے افعال و اقوال سے ہر جگہ اس خیال کو ظاہر کیا ہے کہ ذات الٰہی ہی ہر چیز کا مرکز و محور اور بنیاد ہے؟ اور اس خیال نے اُن کی شخصیت میں ایک بے نیازی ایک رکھ رکھاؤ اور وقار پیدا کیا ہے ۔ ان کے یہاں وہ جو ایک لیے دیے رہنے والی کیفیت نظر آتی ہے ، اس کی اصل وجہ بھی یہی ہے ۔ لیکن میر کی شخصیت میں اس تصوف نے جس پہلو کو سب سے زیادہ نمایاں کیا ہے وہ انسانیت کا خیال اور انسانی قدروں کا احساس ہے ۔ میر کی شخصیت میں انسانی زندگی کی کامیابیوں اور کامرانیوں ، حسرتوں اور ناکامیوں دونوں کا شدید احساس نظر آتا ہے ۔ میر انسان اور انسانی زندگی کو سمجھتے ضرور تھے ۔ وہ اس کے بنیادی معاملات کا شعور ضرور رکھتے ہیں ۔ یہ صحیح ہے کہ ان کے یہاں اس کی المناکی کا احساس نسبتاً زیادہ ہے لیکن وہ اس کی مسرتوں سے بھی ناواقف نہیں ہیں ، بلکہ یہ محسوس کرتے ہیں کہ انسانی زندگی ان دونوں پہلوؤں سے عبارت ہے ۔ انسان کی بڑائی اس میں ہے کہ وہ مسرتوں کے ساتھ غموں کو بھی برداشت کرتا رہے ۔ اسی لیے میر انسان کے ساتھ ایک ہمدردی رکھتے ہیں ۔ انھیں انسانی زندگی سے محبت ہے ۔ شاید اس لیے کہ انسان انھیں عظیم نظر آتا ہے اور عظیم اس لیے نظر آتا ہے کہ وہ دنیا میں مجبور و معذور ہونے کے باوجود اس سے نبرد آزما ہوتا ہے ۔ انسان کی اس عظمت کے خیال اور احساس نے خود میر کی شخصیت میں ایک عظمت پیدا کر دی ہے ۔ ان کی زندگی کے مد و جزر کو دیکھیے اور ان کے کلام کو

پڑھیے تو قدم قدم پر اس حقیقت کا احساس ہوتا ہے کہ وہ ایک عظیم انسان ہیں ، اور ان کا کلام بھی عظمت سے ہم کنار ہے ۔

ایک خاصا زمانہ میر کی زندگی میں ایسا گزرا ہے جب وہ فقیروں اور درویشوں کے ساتھ رہے ہیں ۔ اپنے والد میر علی متقی اور اور اپنے منہ بولے چچا سید امان اللہ سے قطع نظر ، ان دونوں بزرگوں کی وساطت سے انھیں بعض درویش ایسے بھی ملے ہیں جن کی نصیحتوں نے ان کی شخصیت کو ایک مخصوص سانچے میں ڈھالا ہے ۔

"ذکر میر" میں ان ملاقاتوں کا حال میر نے خاصی تفصیل سے لکھا ہے ۔ اس تفصیل میں جو کام کی چیز ہے ، وہ درویشوں کے پند و نصائح ہیں جن سے میر نے اثر قبول کیا ہے ، اور جس کی صدائے بازگشت ان کی شخصیت اور فن میں جگہ جگہ سنائی دیتی ہے میر نے لکھا ہے کہ ان کے چچا امان اللہ درویشوں سے ملنے کے بہت شوقین تھے ۔ چنانچہ جب بھی کسی خدا رسیدہ فقیر کی خبر ملتی تو اس سے ملنے جاتے اور خود میر کو بھی ساتھ لے جاتے ۔ ایک دفعہ وہ ایک فقیر کے پاس گئے جو شب و روز یاد الٰہی میں محو رہتا تھا اور اسے دنیا میں کسی چیز کی پروا نہیں تھی ۔ اس نے جو نصیحتیں کیں ، ان کا نچوڑ میر کے الفاظ میں یہ ہے :

"اے عزیز ! اگر آں محبوب سراپا ناز پیش چشم است ، بہشت جاوید ، و اگر از نظر رفت ، ہماں دوزخِ عاشق ناامید بدانکہ سرکلافہ پیدا نمی شود ۔ یعنی بر ما ہیچ ہویدا نیست ۔ نہ می دانیم کہ زاہدان ریاضت ہمیشہ چہ در سردارند و بے خودانِ شوقِ آں مست سر انداز ۔ کہ خبر ۔ جمعے را خلشِ خواہشے

جاعتے را کاوشِ کاہشے ۔ کسانیکہ حق شناسند مبّرا از امید و یاس اند ۔ عزیزانے کہ باخدایند ، دل دادگان رضامند ۔ جان عاشقان را کہ بہ تلخی کار است ، خونِ ایشان شیریں بسیار است ۔ رنج را برخود گواران کن تاشایانِ راحت شوی ۔ کار را بسیار با خود تنگ بگیرتا بہ فراغت روی ۔ دل برداشتن ازیں عالم خوب است ۔ اگر معرفت حق میسّر نہ شود ، ایں ہم خوب است ، عمارتِ دنیا در گردیدنی است ۔ بنائے ایں بروہم گزاشتہ اند ۔ اگر بہ مقصود رسیدنی خواہی ، در دلے راہ کن ۔ ہر چہ از دستِ کوتاہ خدمتت بر آیدتلہ کن ۔ اگر آشنائے دریائے تہ دار حقیقت نمی توانی شد ، بارے بر کراں باش ، یعنی اگر دفعۃ بر مردنِ خود قادر نیستی ، آمادۂ دادنِ جان باش ۔ خود را از قید دیر و مسجد دارہاں ، یعنی باخدا باش و در ہمہ جا بماں[1] ۔"

ان نصیحتوں نے میر کو میر بنا دیا اور اسی قسم کی نہ جانے کتنی نصیحتوں کی آوازیں ان کے کانوں میں پڑتی رہیں ۔ ان کے اثرات میر پر ہونے ہی چاہیے تھے ۔ چنانچہ یہ اثرات ہوئے ۔ کیونکہ درویشوں اور فقیروں کی صحبت جو انھیں میسر تھی اور ان صحبتوں میں جو باتیں ہوتی تھیں ، ان سے میر کا متاثر ہونا ناگزیر تھا ۔

میر کی شخصیت میں مادی زندگی سے بےنیازی اور اس کے نتیجے میں وہ جو ایک بے دماغی ملتی ہے ، اس کی تہ میں بھی ان درویشوں اور فقیروں کی صحبتوں اور نصیحتوں کا ہاتھ ہے ۔ میر نے

---

۱ ۔ ذکر میر ، ص ۳۶ - ۳۷

زندگی میں ایسے ایسے خدا رسیدہ لوگوں کو دیکھا ، اور وہ ایسے ایسے بزرگوں کے ساتھ رہے جو بڑے بڑوں کو خاطر میں نہیں لاتے تھے ۔ جن کی اپنی ایک دنیا تھی ، اور وہ اس دنیا میں مست تھے ۔ میر نے بھی زندگی بھر کسی کی پروا نہیں کی ، کیونکہ وہ بھی اپنے حال میں مست رہے ۔ انہیں امرا اور رؤسا سے ساری زندگی کوئی دل چسپی نہیں رہی ۔ کیونکہ درویشوں کی صحبتوں نے تو انہیں یہ سکھایا تھا کہ دنیا کی ہر چیز فنا ہو جانے والی ہے اور عزت ، دولت ، ثروت اور شہرت کو اس زندگی میں کوئی پائیداری حاصل نہیں ۔ پائیداری اور استواری تو صرف خودداری کو حاصل ہے ۔ چنانچہ خودداری کا احساس میر کی شخصیت میں بہت نمایاں ہے اور اس خودداری نے ان کی شخصیت اور فن میں بڑے بڑے کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں ۔ ان کے بہت سے تصورات اسی خودداری کے گرد گھومتے ہیں ۔ آزاد نے جس کو ان کی بد دماغی بتایا ہے وہ در حقیقت یہی خودداری کے احساس کی حد سے بڑھی ہوئی ایک صورت ہے ۔

یہ خودداری اور بے دماغی میر کی شخصیت میں عجیب عجیب صورتیں اختیار کرتی رہی ہے ۔ ان کی زندگی میں وہ جو ایک چبھن اور خلش کا احساس ہوتا ہے ، وہ بھی اسی کا پیدا کردہ ہے ۔ ان کی زندگی جو ایک المیہ نظر آتی ہے ، اس کی تہ میں بھی اسی کی کارفرمائی ہے ۔ وہ جو زندگی سے بھاگتے پھرتے ہیں اس میں بھی اسی کا ہاتھ دکھائی دیتا ہے ۔ وہ جو ذرا ذرا سی بات پر جذباتی ہو جاتے ہیں ، اس میں بھی اسی کے اثرات کا پتہ چلتا ہے ۔ ان کے یہاں چھوٹی چھوٹی باتوں کو مسائل بنا لینے کا جو میلان نظر آتا ہے ،

وہ بھی اسی کا نتیجہ ہے ۔ غرض میر کی اس کیفیت نے انھیں عجیب عجیب حالات سے آشنا کیا ہے ۔ بعض اوقات اس سلسلے میں ان کی زود حسی نے زندگی کے بعض معمولات کو ان کے لیے حادثات بنا دیا ہے اور زندگی میں ظہور پذیر ہونے والے عام واقعات ان کے لیے بڑے اہم سانحات کا روپ اختیار کر گئے ہیں ۔

اسی لیے میر نے اپنی زندگی میں ہمیشہ چھوٹی سے چھوٹی بات کو بڑی سے بڑی بات سمجھا ہے ۔ انھوں نے زندگی میں بے شمار ٹھوکریں کھائی ہیں ، ان کا رد عمل میر کی شخصیت پر ہوا ہے ۔ لیکن جتنا عام حالات میں ہونا چاہیے اس سے کہیں زیادہ ہوا ہے ۔ بلکہ بعض مقامات پر تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ سیدھی بات کو بھی انھوں نے اُلٹا سمجھ لیا ہے اور اچھے پہلوؤں سے بھی برے پہلو نکالے ہیں ۔ انسان جب اپنی ذات کے بارے میں حد درجہ حساس ہو جاتا ہے تو پھر اس صورتِ حال کا پیدا ہونا یقینی ہوتا ہے ۔

میر کے مزاج کی اسی خصوصیت نے انھیں خاندانی حالات کے ناسازگار ہونے کا کچھ زیادہ ہی احساس دلایا ہے اور وہ اپنی خاندانی زبوں حالی اور پریشانی سے کچھ زیادہ ہی متاثر ہوئے ہیں ۔ جہاں بھی اس کا ذکر انھوں نے کیا ہے ، ڈوب کر کیا ہے ۔ حالانکہ براہ راست اُن پر اپنے آبا و اجداد کی پریشانی کا کوئی اثر نہیں ہوا ہے ۔ کیونکہ جس وقت یہ اثر ہونا چاہیے تھا ، اس وقت اُن کے والد کی درویشی آڑے آ گئی تھی اور اس نے اس جہاں کے بہت سے غم غلط کر دیے تھے ۔ لیکن اس درویشی کی قُربت نے میر پر مختلف زاویوں سے کچھ ایسا اثر ڈالا کہ اُن کی دنیا ہی بدل گئی ۔

چنانچہ اس کے بعد میر کی زندگی میں جو کچھ ہوا ہے، اس کے نقوش اُن کی شخصیت پر بہت گہرے ہیں - اس زمانے میں اُن کا احساس اتنا شدید اور ان کا تاثر اس قدر عمیق ہو جاتا ہے کہ ان کے لیے زندگی ایک الجھن بن جاتی ہے -

میر کو اپنی زندگی میں سب سے پہلے جس سانحے سے دو چار ہونا پڑا ہے ، وہ ان کے والد کا انتقال ہے - میر پر اس واقعے کا جتنا اثر ہونا چاہیے تھا ، اس سے کہیں زیادہ گہرا ہوا ہے -کیونکہ اس وقت تک وہ حد درجہ حساس ہو چکے تھے - ویسے یتیمی بہ ذات خود کوئی معمولی بات نہیں - لیکن میر کے لیے اس کی حیثیت ایک بہت بڑے سانحے کی تھی - میر اس کے بعد ہر اعتبار سے بے یار و مددگار رہ گئے اور اس سے زیادہ انھوں نے اپنے آپ کو بے یارو مددگار محسوس بھی کیا - چنانچہ ''ذکر میر،' میں اس سانحے کو بیان کرکے اپنی ذہنی کیفیت کی تصویر انھوں نے یوں کھینچی ہے :

''جہاں در چشم من سیاہ گردید - حادثہ عظیمے روداد - آسمان بر من بیفتاد - دریا دریا گریستم - لنگر از کف دادم - سر را برسنگ زدم - برخاک افتادم - کل و مکل بسیار شد ، قیامت پدیدار شد[۱] -"

اس بیان سے صاف ظاہر ہے کہ باپ کی موت سے میر کے دل پر ایک کاری زخم لگا جو ساری زندگی مندمل نہ ہو سکا - یہی منبع ہے جہاں سے میر کی زندگی کی ساری الجھنیں اور پریشانیاں شروع ہوئیں

---

۱ - ذکر میر ، ص ٦٠

باپ کا سایہ سر سے کیا اٹھا زندگی کا سارا بوجھ ان پر آ پڑا اور ذہنی طور پر وہ اپنے آپ کو یکہ و تنہا محسوس کرنے لگے۔ اُن کی شخصیت سے جو روحانی فیض انھیں حاصل تھا، اس کے دروازے بھی بند ہو گئے۔ دنیا اُن کی نظروں میں واقعی اندھیر ہو گئی اور وہ اس اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں مارنے لگے۔ انھیں کوئی راستہ نظر نہ آیا۔ چنانچہ ساری زندگی اسی اندھیر میں بھٹکتے ہوئے گزر گئی اور منزل سے ہم کنار ہونا انھیں نصیب نہ ہوا۔

یہ صدمہ بہ ذات خود بھی میر کے لیے کچھ کم نہ تھا۔ لیکن اس کے نتیجے میں جو حالات پیدا ہوئے، اور میر کو جن مصیبتوں سے دو چار ہونا پڑا، وہ تو اس صدمے سے کہیں زیادہ صدمات کا پیش خیمہ ثابت ہوئے۔ میر کے قدم ڈگمگا گئے اور ساری زندگی انھیں سکون میسر نہ آ سکا۔ بس مارے مارے پھرتے رہے اور زندگی اسی طرح بیت گئی۔ سوتیلے بھائیوں نے عرصہ حیات تنگ کر دیا۔ قرض خواہوں کی وجہ سے جان پر آ بنی۔ میر لکھتے ہیں:

”برادر کلانِ من ترک مردم داری گرفت و بے چشم و روئی اختیار نمود۔ دید کہ پدر آستین کہنہ داشت و بہ بے کسی جامہ گذاشت۔ قرض خواہاں دامن گیر من خواہند شد، پہلو تہی کرد، و گفت کسانے کہ ہم گیر ناز و نعم بودند و کار آنہا دانند و کار آنہا۔ من در حیات پدر دخیل کارے نہ گشتم، از وقف اولادی ہم گزشتم۔ سجادہ نشینان او سلامت باشند، سر را می کنندوجہ را می خراشند آنچہ مصلحت وقت خواہد بود، خواہند نمود۔ من کہ تازہ بے کس شدہ بودم، چوں سخنان بے تہ او

را شنودم ، غم و غصہ بسیارے خوردم ، التجا بہ او نبردم ،
کمر را محکم بستم ، نظر برخدا نشستم[1] ۔''

غرض میر کو ان حالات سے دو چار ہونے کے بعد بالاخر چھوٹی سی عمر میں معاش کی فکر دامن گیر ہوئی اور اس کے لیے انھیں در در کی خاک چھاننی پڑی ۔ ساری زندگی وہ ہاتھ پاؤں مارتے رہے لیکن کچھ نصیب نہ ہوا ۔ ظاہر ہے ان حالات کے اثرات میر کی شخصیت پر اداسی اور غم گینی کی صورت میں نمایاں ہونے ہی چاہیے تھے ۔

میر کی زندگی میں یہ صدمات کچھ کم نہ تھے کہ ایک صدمہ انھیں غریب الوطنی کا بھی اٹھانا پڑا ۔ معاش کی تلاش میں وطن کو خیرباد کہنا ان کے لیے خاصا اندوہ ناک تھا ۔ چنانچہ جہاں بھی اس کا ذکر کیا ہے ، وہاں ایک ایک لفظ سے حسرت ٹپکتی ہے ۔ ذکر میر میں ہی میں لکھتے ہیں :

''بہ تلاش روزگار در اطراف شہر استخواں شکستم ، لیکن طرفے نہ بستم ، یعنی چارۂ کار در وطن نہ یافتم ، ناچار بہ غربت شتافتم ۔ رنج راہ برخود ہموار کردم ، شدائد سفر اختیار کردم ۔ بہ شاہجہان آباد دہلی رسیدم ۔ بسیار گردیدم ، شفیقے نہ دیدم[2] ۔''

ان حالات میں ظاہر ہے کہ میر کو پریشان ہونا ہی چاہیے تھا ۔ چنانچہ وہ پریشان ہوئے اور یہ پریشانی ساری زندگی ان کے دم کے

۱ ۔ ذکر میر ، ص ۶۰ ، ۶۱
۲ ۔ ذکر میر ، ص ۶۳

ساتھ رہی - میر کو اس کا بڑا غم رہا اور بہت سے غموں کے ساتھ اس غم کی آگ بھی انھیں سلگا سلگا کر جلاتی رہی - زندگی بھر اس غم سے انھیں چھٹکارا نہ ملا - کیونکہ غربت انھیں ایک جگہ سے دوسری جگہ اور دوسری جگہ سے تیسری جگہ لیے لیے پھرتی رہی - غرض پاؤں میں چکر ہی رہا -

پھر سمندِ ناز پر ایک تازیانہ یہ ہوا کہ اس غم روزگار میں غم عشق بھی شامل ہو گیا - ان کے عشق کا واقعہ بظاہر تو ایک معمولی سا واقعہ تھا - لیکن اس سے جو اثرات انھوں نے قبول کیے ہیں ، انھوں نے اس کی اہمیت بہت بڑھا دی ہے - میر کے عشق میں دو پہلو خاص طور پر نمایاں ہیں - ایک تو یہ کہ ان کی شخصیت میں عشق کرنے کی پوری صلاحیت تھی - جب سے انھوں نے ہوش سنبھالا ، ان کے یہاں اس کی زمین ہموار ہو رہی تھی اور اس کے نتیجے میں انھیں عشق کرنا ہی چاہیے تھا - اس لیے انھوں نے پوری شدت سے عشق کیا - ان کے یہاں عشق کی ایک والہانہ کیفیت ہے - خود میر کو اس پر قابو نہیں رہا - دوسرے یہ کہ انھیں اس عشق میں کامیابی اور کامرانی کا منہ دیکھنا نصیب نہ ہوا - اس لیے عشق ان کے یہاں غم سہنے اور رنج اٹھانے کا مترادف ہو گیا - اس پر رسوائی اور بدنامی مستزاد ہوئی - مخالفتوں کا طوفان اٹھا - ہنگامے ہوئے - ہر شخص نے انھیں مجرم گردانا - اپنے اور بیگانے سب دشمن ہو گئے اور اس عالم میں میر نے اپنے آپ کو تنہا پایا - ان میں حالات سے مقابلے کی سکت نہ رہی - وہ کڑھتے رہے - ان کی آرزوں کا خون ہوتا رہا - جذب و شوق پر موت کے سائے ناچتے رہے -

جو چاہا وہ نہ ہوا ۔ جو کچھ وہ کرنا چاہتے نہ کر سکے ۔ اور اس صورت حال نے انھیں جلا کر خاک کر دیا ۔ راکھ کا ایک ڈھیر بنا دیا ، اور بالاخر ان کی شخصیت نے ایک شمع کشتہ کی سی صورت اختیار کرلی ۔

میر کی شخصیت میں جس عشق کی ہنگامہ آرائی نظر آتی ہے اس میں بڑی صداقت ہے ، بڑا خلوص ہے ۔ وہ فطری ہے ۔ اس کو پیدا ہونا ہی چاہیے تھا ۔ کیونکہ جس وقت سے میر نے ہوش سنبھالا اسی وقت سے ان کے کانوں میں یہ باتیں پڑتی رہیں کہ عشق ہی سب کچھ ہے ۔ عشق کے سوا دنیا میں کچھ بھی نہیں ۔ حیات و کائنات کا سارا نظام عشق ہی کے دم قدم سے قائم ہے ۔ ان کے والد میر علی متقی ، جیسا کہ میر نے خود لکھا ہے ۔ اکثر عشق کے بارے میں کچھ اس قسم کی باتیں ان کے کانوں میں ڈالتے رہتے تھے :

"اے پسر ! عشق بورز ۔ عشق است کہ دریں خانہ متصرف است ۔ اگر عشق نمی بود ، نظم کل صورت نمی بست ۔ بے عشق زندگانی وبال است ۔ دل باختۂ عشق بودن کمال است ۔ عشق بسازد ، عشق بسوزد ۔ در عالم ہرچہ ہست ظہور عشق است ۔ آتش سوز عشق است ۔ آب رفتار عشق است ۔ خاک قرار عشق است ۔ باد اضطرار عشق است ۔ موت مستی عشق است ۔ روز بیداریٔ عشق است ۔ مسلم جمال عشق است ، کفر جلال عشق است ۔ صلاح قرب عشق است ۔ گناہ بعد عشق است ۔ بہشت شوق است ۔ دوزخ ذوق عشق است ۔ مقام عشق از عبودیت و عارفیت و زاہدیت و صدیقیت و خلوصیت و مشتاقیت و خلیت

و حبیبیت بر تراست - جمعے برآنندہ کہ حرکت آسمانہا حرکت عشقی است - یعنی بہ مطلوب نمی رسند و سرگداانند -

بے عشق نباید بود ، بے عشق نباید زیست
پیغمبرِ کنعانی عشق پسرے دارد[1]

ظاہر ہے کہ جب ایسی باتیں کانوں میں ہر وقت پڑتی رہیں گی تو ان کا جزو مزاج بن جانا یقینی ہے - چنانچہ میر کے ساتھ ایسا ہی ہوا - عشق کے خیال نے ان کے دل میں گھر کر لیا اور عشق کے بارے میں یہ باتیں ان کی طبیعت کے بنیادی عناصر میں داخل ہو گئیں اور میر غیر شعوری طور پر اس عشق کی تلاش و جستجو میں سرگرداں رہنے لگے - میر نے جو کچھ عشق کے بارے میں سنا تھا ، اس کی نوعیت ، اس میں شک نہیں ، کہ مجازی اور مادی نہیں تھی ، بلکہ تمام تر حقیقی اور روحانی تھی - لیکن چونکہ میر کو اس کا بھی احساس تھا کہ مجاز حقیقت کی پہلی منزل ہے اس لیے انھوں نے ایک پیکر مجاز میں اپنے آپ کو گم کر دیا اور ساری زندگی اسی میں گم رہے - انھوں نے اس سے زیادہ اس کے خیال سے عشق کیا اور اس صورت حال کے ہاتھوں وہ عجیب و غریب حالات سے دو چار ہوئے - بہر حال اس عشق کی صداقت سے انکار ممکن نہیں -

اس عشق نے میر کی شخصیت میں بعض معیاروں کے احساس کو بیدار کیا ہے - کچھ اصولوں کی اہمیت واضح کی ہے ، اور اس میں شک نہیں کہ میر نے ساری زندگی ان اصولوں اور معیاروں کا خیال رکھا ہے - اس عشق کا اپنا ایک نظام ہے اور میر اس نظام

---

۱ - ذکر میر : صفحہ ٦

عشق کے بہت بڑے علم بردار ہیں ۔ اُن کی شخصیت میں صداقت اور پاکیزگی اور سپردگی ، ایثار اور قربانی ، درد اور خستگی کے جو عناصر ہیں ، ان کو اسی نظام عشق نے پیدا کیا ہے ۔ میر کی شخصیت میں یہ پہلو سب سے زیادہ نمایاں ہے اور وہ انھی پہلوؤں سے پہچانے جاتے ہیں ۔

میر کی شخصیت میں جذبہ عقل پر غالب ہے ۔ اس کا ایک سبب ان کی طبیعت کا یہ عشقیہ میلان بھی ہے ۔ لیکن اس کی بنیادی وجہ ان کی اُفتاد زندگی ہے ۔ میر کو ابتدا ہی سے ایسا ماحول ملا جس میں عقل سے کہیں زیادہ جذبے کی حکمرانی تھی ۔ شعور سے کہیں زیادہ وجدان کا سکہ چلتا تھا ۔ پھر اس کے ساتھ ایک بات یہ بھی ہے کہ میر کی تربیت تو ہوئی لیکن عرفِ عام میں جس کو تعلیم سے تعبیر کیا جاتا ہے ، اس کے مواقع انھیں بہت کم ملے ۔ اس میں شک نہیں کہ اپنے والد میر علی متقی اور اپنے منہ بولے چچا سید امان اللہ سے انھوں نے بہت کچھ حاصل کیا ۔ لیکن میر بہ مشکل سن شعور کو پہنچے تھے کہ ایک ہی سال میں صرف دس مہینے کے وقفے سے دونوں انتقال کر گئے ۔ اور اس کے بعد میر کی زندگی میں سخت افراتفری اور انتشار کا دور شروع ہوا ۔ اس عالم میں تعلیم کی طرف باقاعدہ توجہ ناممکن تھی ۔ ویسے دلی کے دورانِ قیام میں انھوں نے تعلیم کی طرف اپنا میلان ضرور ظاہر کیا اور حتی الامکان اس بات کی کوشش بھی کی کہ تعلیم کا سلسلہ کسی نہ کسی طرح جاری رہے ۔ چنانچہ اس عسرت اور پریشانی کے عالم میں بھی اس خیال کا دامن ان کے ہاتھ سے نہ چھوٹا ۔ میر جعفر عظیم آبادی سے اُن کی ملاقات اور تعلیم حاصل کرنے کے بارے میں گفتگو اس حقیقت کو واضح

کرتی ہے کہ انھیں اس کا شوق ضرور تھا ۔ وہ اس شمع کے پروانے ضرور تھے ۔ اگرچہ اس زمانے میں ان پر مفلسی اور بیکاری مسلط تھی لیکن اس کے باوجود انھوں نے میر جعفر کی شرط مان کر تعلیم حاصل کرنے کا سلسلہ شروع کر دیا ۔ خود لکھا ہے :

"روزے بر سرِ بازار ، جزو کتابے در دست نشستہ بودم ۔ جوانے میر جعفر نام ازاں راہ گزشت ۔ نظرش بر من افتاد و تشریف داد ۔ بعد از ساعتے گفت کہ اے عزیز ، دریافتہ می شود کہ ذوق خواندن داری ۔ من ہم کشتۂ کتابم ۔ اما مخاطبے نمی یابم ۔ اگر شوق در رشتہ باشی ، چندے رسیدہ باشم ۔ گفتم ، دستے نہ دارم کہ خدمتے از من بیاید ۔ اگر تو ایں رنج بر خود گوارا کنی ، عین بندہ نوازی است ۔ گفتار ایں قدر ہست کہ تہ پاتا نہ باشد ، پا بیرون نمی گزارم ۔ گفتم خدائے کریم آساں خواہد کرد ۔ اگرچہ من ہم چیزے نہ دارم ۔ پا ورقہائے آں نسخۂ درہم را مطابق سر صفحہہائے آیندہ کردہ ، داد و رفت ۔ ازاں روز اکثر ملاقات آں ملک سیرت و آدم صورت اتفاق می افتاد و بہ لطف نہاتیم زباں می داد ، یعنی دماغِ خود می سوخت و مرا چیزے می آموخت ۔ تا مقدور من نیز باش نرم زیرِ سر او می گزاشتم ، یعنی صرف او بود ، آنچہ میسر می داشتم[1] ۔"

لیکن ظاہر ہے اس تعلیم میں بھی کوئی باقاعدگی نہیں تھی ۔ البتہ اس واقعے سے میر کا میلان تعلیم کی طرف ضرور نظر آتا ہے اور یہ میلان ساری زندگی ان کے ساتھ رہا ہے ۔ لیکن زمانے نے انھیں اتنی

---

۱ ۔ ذکرِ میر ، ص ٦٦

فرصت نہیں دی کہ وہ اس کو تکمیل تک پہنچا سکیں - ویسے انھوں نے فارسی اور عربی پڑھی - ان زبانوں میں ان کو دست گاہ بھی تھی - کتابوں کے وہ شوقین بھی تھے - خانِ آرزو کی صحبت سے بھی انھیں بہت کچھ حاصل ہوا لیکن جو کچھ وہ چاہتے تھے وہ انھیں اس سلسلے میں حاصل نہ ہو سکا - میر علی متقی اور امان اللہ جلد ہی مر گئے - میر جعفر علی ملنے کے کچھ ہی عرصے بعد اپنے وطن عظیم آباد چلے گئے ، اور خانِ آرزو نے بہت جلد میر سے بیر باندھ لیا - غرض اس معاملے میں بھی میر کو ایک ناکامی ہی سے دوچار ہونا پڑا ، اور اس کی حسرت بھی ان کے دل میں داغ بن کر رہ گئی -

البتہ علم اور تعلیم کی طرف ان کی طبیعت کا میلان ہمیشہ رہا اور اسی کا یہ نتیجہ تھا کہ انھوں نے اس سلسلے میں بہت کچھ حاصل بھی کر لیا - فارسی زبان پر انھیں خاص طور پر قدرت حاصل ہوگئی - امیرالامرا صمصام الدولہ سے ملاقات کے وقت برجستہ طور پر ان کے مدارالمہام کی زبان کی غلطی کی طرف اشارہ کرنا اس حقیقت کو واضح کرتا ہے - میر نے کتنی بے باکی سے اس واقعے کو لکھا ہے :

”التماسے کہ نوشتہ بودم از کیسہ برآوردم - ناگاہ از زبان خواجہ مذکور برآمد کہ وقت قلم دان نیست - چوں ایں سخن شنیدم بہ قاہ قاہ خندیدم - نواب در روئے من دید، سبب خندہ پرسید - عرض نمودم کہ ایں عبارت را نہ فہمیدم - اگر ایشاں می گفتند ، قلم دان بردار حاضر نیست - ایں حرف گنجائش داشت یا وقت دستخط نواب نیست بابتی بود - وقت قلم دان نیست ، انشائے تازہ است قلم دان چوبی پیش نمی باشد - وقت در غیر وقت نمی

داند۔ بہ ہر نفرے کہ اشارت رود برداشتہ بیارد ۔ نواب بہ خندہ درآمد و گفت کہ معقول می گوید ۔''[1]

یہ واقعہ میر کے لسانی شعور پر دلالت کرتا ہے - اس سے یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ وہ اتنی چھوٹی عمر میں بھی زبان کے مزاج کو سمجھتے تھے - اس کے روزمرہ اور محاورے کا انھیں صحیح علم تھا اور یہ بات کاوش اور محنت ہی سے پیدا ہو سکتی ہے - میر نے زبان کے سلسلے میں یہ محنت کی ہے لیکن شاید اس کی وجہ ان کا شاعرانہ مزاج ہے - شاعری زبان کے شعور کا تقاضا کرتی ہے میر کے یہاں یہ شعور اسی وجہ سے پیدا ہوا ہے -

اور میر کی شاعرانہ مزاجی سے کسی کو انکار نہیں ہوسکتا - تصوف سے قربت نے ان کی شخصیت میں اس پہلو کو ابھارا اور وہ وقت کے ساتھ ساتھ اس سے قریب ہوتے گئے - اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ چھوٹی عمر ہی میں ان کی شاعرانہ حیثیت تسلیم کر لی گئی - انھوں نے خود اس کا اظہار کیا ہے - لکھتے ہیں :

"بعد از چندے با سعادت علی نام ، سیدے کہ از امروہہ بود ، برخوردم - آن عزیز مرا تکلیف موزوں کردن ریختہ ، کہ شعرے است بہ طورِ شعرِ فارسی ، بہ زبان اردوئے معلّٰی بادشاہ ہندوستان و در آں وقت رواج داشت ، کرد - خودکشی جہد بلیغ کردم و مشق خود بہ مرتبۂ رساندم کہ موزونانِ شہر را مستند شدم - شعر من در تمام شہر دوید و بہ گوش خرد و بزرگ رسید[2] ۔''

---

۱ - ذکرِ میر ، ص ۶۲ - ۶۳

۲ - ذکرِ میر ، ص ۶۲ - ۶۳

اس بیان سے یہ بات صاف ظاہر ہے کہ میر نے بہت جلد اس فن میں کمال حاصل کر لیا تھا اور ان کی شاعرانہ شہرت دور دور تک پھیل گئی تھی - اس میں یقیناً خان آرزو کے فیضِ صحبت کو بھی دخل ہوگا - بہرحال مطلب یہ ہے کہ میر بنیادی طور پر ایک شاعرانہ مزاج رکھتے تھے - اس کی تکمیل کے انھیں مواقع بھی ملے - البتہ دوسرے علوم سے انھیں لگاؤ نسبتاً کم رہا - اس لیے وہ زندگی کے ہر دور میں عقل سے زیادہ جذبے کی طرف جھکتے گئے -

میر کی شخصیت میں جذبے کی طرف جھکاؤ بہت نمایاں نظر آتا ہے - جیسا کہ پہلے کہا گیا ، اس کا ایک سبب تو تعلیم کی بے قاعدگی ہے - دوسرے ان کی زندگی کا عشقیہ پہلو ہے اور تیسرے ان کا شاعرانہ مزاج ہے - ان تینوں نے مل کر میر کو عقل کے مقابلے میں جذبے سے نسبتاً زیادہ قریب کیا ہے ــــ اور یہ صورتِ حال ان کی زندگی میں برابر نئے نئے گل کھلاتی رہی ہے -

وہ زمانہ جس میں میر کی شخصیت کی نشو و نما ہوئی ہے ، بڑے انتشار کا زمانہ ہے - اس انتشار میں سیاسی ہنگامے ، معاشی ، معاشرتی افراتفری ، تہذیبی و ثقافتی ابتری سب ہی کچھ شامل ہے - ان سب نے مل کر مجموعی طور پر میر کی شخصیت پر گہرے نقوش چھوڑے ہیں - ان کی زندگی میں اندر تو اندھیرا تھا ہی ، ان حالات نے اس کے باہر بھی اندھیرا کر دیا ہے - چنانچہ میر اس اندھیرے میں ہی سرگرداں رہتے ہیں - انھوں نے سلطنتوں کو ختم ہوتے ، بادشاہوں کی آبرو کو مٹی میں ملتے ، شریفوں اور نجیبوں کو در بدر کی خاک چھانتے ، عوام کو روٹی کے لیے ترستے دیکھا ہے - ان کی آنکھوں کے سامنے شہر لوٹے گئے ہیں ، آبادیاں ویران کی گئی ہیں -

ہزاروں بے گناہوں کے خون سے ہولیاں کھیلی گئی ہیں ۔ لاکھوں انسانوں کو خانماں برباد ہونا پڑا ہے اور اس طرح زندگی پر موت رقص کرتی رہی ہے ۔ ان حالات نے میر کا جی سرد کر دیا ۔ جینے سے وہ بیزار ہوگئے اور ایک قلزم خوں ان کے اندر موجیں مارنے لگا ۔ انھیں خود موت نہیں آئی ۔ لیکن ان حالات نے ان کی زندگی کو موت میں تبدیل کر دیا ۔

ان حالات نے سب سے زیادہ میر کی جذباتی زندگی کو ٹھیس لگائی ۔ اس کی بنیادیں ہل گئیں ۔ شہروں کا لٹنا ، بستیوں کا ویران ہونا ، سلطنتوں کا مٹنا اور شاہوں کے تاج و تخت کا خاک میں ملنا بہ ذات خود اتنا متاثر کرنے والا نہیں تھا جتنا کہ یہ خیال کہ ان کے ساتھ بیسیوں جذباتی پہلو تھے جو فنا کی نیند سوگئے ۔ میر کو ان سب کے ساتھ لگاؤ تھا ۔ یہ ساری تباہی میر کی ذاتی تباہی کے ساتھ ساتھ ان کے وطن کی تباہی بھی تھی ۔ اس زمانے کے علوم و فنون کی تباہی بھی تھی ۔ اسی لیے میر نے اس صورتِ حال پر خون کے آنسو بہائے ہیں ۔ 'ذکرِ میر' میں انھوں نے جذبے کی کس شدت کے ساتھ اس کیفیت کو بیان کیا ہے ، جس سے دلی کو درانیوں کے حملے کے بعد دوچار ہونا پڑا ، لکھا ہے :

''روزے پرست زوم ۔ راہم بر ویرانۂ تازۂ شہر افتاد ۔ بر ہر قدمے گریستم و عبرت گرفتم و چوں بیش تر رفتم ، حیران ترشدم ، مکان‌ہا را نہ شناختم ، دیارے نہ یافتم ۔ از عمارت آثار نہ دیدم ۔ از ساکنان خبر نہ شنیدم ۔''[1]

---

۱ ۔ ذکرِ میر ، ص ۹۹

از ہر کہ سخن کردم گفتند کہ ایں جانیست
از ہر کہ نشاں جستم گفتند کہ پیدا نیست

خانہ ہا نشستہ ، دیوار ہا شکستہ ، خانقاہ بے صوفی ، خرابات بے مست خرابہ بود ، ازیں دست تا بہ آں دست :

ہر کجا افتاد دیدم خشت در ویرانۂ
بود فردِ دفتر احوالِ صاحب خانۂ

بازار ہا کجا کہ بہ گویم ، طفلاں تہ بازار کجا ، حسن کو ، کہ بہ پرسم ، یاران زرد رخسار کو ، جواناں رعنا رفتند ، پیران پارسا گزشتند ، محل ہا خراب ، کوچہ ہا نایاب ، وحشت ہویدا ، آنس ناپیدا ، رباعی استادے بیادم آمد :

افتاد گزارم چو بہ ویرانۂ طوس
دیدم چغدے نشستہ برجائے خروس

گفتم چہ خبرداری ازیں ویرانہ ؟
گفتا خبر این است کہ افسوس! افسوس[1] !

اس عبارت کے ایک ایک فقرے سے یہ حقیقت ٹپکتی ہے کہ تباہی پر میر کو جو غم ہوا وہ محض انفرادی نہیں تھا ۔ اس کی نوعیت اجتماعی ، معاشرتی اور تہذیبی بھی تھی ۔ آن کی نگاہیں اس ایک ایک چیز کو دیکھتی تھیں جس کو اس ہنگامے نے اپنی جگہ سے ہٹا دیا تھا ۔ مکان ہٹ جاتے تو صبر تھا ، عمارتیں ختم ہو جاتیں تو ایسی کوئی بات نہیں تھی ۔ میر کو غم تو اس بات کا تھا کہ

---

۱ ۔ ذکر میر ص ۹۹

بازاروں کا وجود ہی باقی نہ رہا - آن کی رونقیں ختم ہوگئیں -
گلی کوچے مٹ گئے - ان کی چہل پہل باقی نہ رہی - جیسے جس طرح
گلیوں میں کھیلتے پھرتے تھے وہ انداز ختم ہوگیا - خانقاہیں اجڑ گئیں -
صوفیوں اور درویشوں کا وہ ماحول نہ رہا - غرض میر کو غم یہ ہے
کہ اس تباہی کے ساتھ ان کے پورے ماحول کی عمارت زمین
پر آ رہی -

یہ ٹھیک ہے کہ ان حالات کی وجہ سے انفرادی طور پر جو
غم انھیں اٹھانا پڑا اور ذاتی طور پر جذبات کا جو خون ہوا اس کا
اثر ان پر بہت زیادہ ہے - کیونکہ ان کی وجہ سے وہ تمام دلچسپیاں
ختم ہوگئیں جو آن کی زندگی میں تھیں - آن تمام چیزوں کا جنازہ
نکل گیا جن سے میر کی زندگی میں رنگ تھا - اس تباہی کو بیان
کرتے ہوئے اپنی ذاتی اور انفرادی تباہی کی تفصیل میر نے کس قدر
ڈوب کر پیش کی ہے - لکھتے ہیں :

"ناگاہ در محلہ رسیدم کہ آں جا می ماندم ، صحبت می داشتم ،
شعر می خواندم ، عاشقانہ می زیستم ، شب ہا می گریستم ،
عشق باخوش قداں می باختم - ایشاں را بلند می انداختم ، باسلسلہ
مویاں می بودم پرستش نکویاں می نمودم - اگر دمے بے ایشاں
می نشستم ، تمنا بر تمنا می شکستم ، بزم می آراستم ، خوباں را
می خواستم - مہمانی می کردم - زندگانی می کردم - دوست
روئے نیامد کہ بار نفس خویش بر آرم - مخاطب صحیحے نہ یافتم
کہ صحبت دارم - بازار وحشت گاہی ، کوچہ بہ صحرا راہی -
ایستادم و بہ حیرت دیدم - مکروہ بسیارے کشیدم - عہد

کردم کہ باز نیایم ۔ تاباشم قصدِ شہر نہ نمایم [1] ۔"

جب وہ جگہ ہی نہ رہے جہاں انسان نے زندگی بسر کی ہو تو اس کا جتنا بھی غم کھایا جائے کم ہے ۔ دیکھنے کی بات یہاں یہ ہے کہ میر کو کسی مادی چیز کا غم نہیں ہے ، غم ان صحبتوں کا ہے جو انھیں میسر تھیں ۔ غم اس ساری زندگی کا ہے جو ایک مخصوص سانچے میں ڈھلی ہوئی تھی ۔ غم ان قدروں کا ہے جنھیں وہ عزیز رکھتے تھے ۔ ظاہر ہے اس کی نوعیت مادی نہیں بلکہ روحانی اور جذباتی ہے ۔ میر پر ساری زندگی اس کا اثر رہا ہے ، اور وہ ایک لمحے کو بھی اس غم سے چھٹکارا حاصل نہیں کر سکے ہیں ۔ یہ غم ان کے مزاج میں داخل ہوگیا ۔ آن کی طبیعت کا جزو بن گیا اور وہ اس شدت غم کی وجہ سے بُجھ کر رہ گئے ہیں ۔

میر کی شخصیت میں جو اداسی اور سوگواری ہے ، اس میں یہ صورتِ حال بھی برابر کی شریک ہے ۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ میر بنیادی طور پر درویش منش تھے ۔ ان کی زندگی میں ایک رندانہ آن اور ایک قلندرانہ شان تھی ۔ وہ اپنے حال میں مست تھے ۔ لیکن اس کے باوجود حالات نے انھیں امراء و رؤسا کے درباروں میں جانے کے لیے مجبور کیا ہے ۔ طوعاً و کرہاً وہ آن درباروں میں گئے بھی ہیں ۔ لیکن انھوں نے اس درباری ماحول سے مطابقت پیدا نہیں کی ہے ۔ انھوں نے ان درباروں کے مذموسات کو محسوس کیا ہے ۔ اسی لیے وہ درباروں میں رہتے ہوئے بھی

---

۱ ۔ ذکرِ میر ، ص ۱۰۰ ۔

درباری نہیں ہو سکے ہیں ۔ انھیں دربار داری آئی نہیں ہے ۔ انھوں نے امیرالامراء صمصام الدولہ ، نواب بہادر ، مہا نرائن دیوان وزیر ، راجہ جُگل کشور ، راجہ ناگر مل جاوید خاں اور آصف خان کی ملازمتیں کی ہیں ۔ اس لیے اس زمانے کے رئیسوں اور درباروں کو انھیں بہت قریب سے دیکھنے کا موقع ملا ہے ۔ لیکن ان امیروں کے قریب رہ کر بھی ان کی انفرادیت برقرار رہی ہے ۔ انھوں نے ان درباروں کے تعیش سے کوئی سروکار نہیں رکھا ہے ۔ ان کی مبالغہ آرائیوں سے انھیں کوئی نسبت نہیں رہی ہے ۔ ان کی لایعنی باتوں سے انھیں کوئی تعلق نہیں رہا ہے ۔ برخلاف اس کے میر نے وہاں رہ کر اس نظام کے کھوکھلے پن کو محسوس کیا ہے اور اس زمانے کے نظامِ اقتدار میں جو تضاد تھا ، اس پر ان کی نظر رہی ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ میر کے یہاں بنیادی انسانی قدروں کی پاسداری کا خیال ہمیشہ نمایاں رہا ہے ۔ انھوں نے انسان کی اہمیت ، اس کی عظمت اور برتری کے خیال کو ہمیشہ اپنے پیش نظر رکھا ہے ۔ اسی لیے ان کی شخصیت میں انسان اور انسانیت کے آہنگ کی آواز برابر سنائی دیتی ہے ـــــ اور اسی صورتِ حال نے ان کے یہاں وہ گداز پیدا کیا ہے ، انسانی زندگی کے ساتھ جس کی حیثیت لازم و ملزوم کی ہے ۔

انسان اور انسانیت کے خیال اور بنیادی انسانی قدروں کے احساس نے میر کو اس زبوں حالی کا احساس دلایا ہے جس کی وجہ سے انسان نے ہر دور میں ذلتیں اُٹھائی ہیں ۔ اپنے آپ کو بدنام اور رسوا کیا ہے ۔ میر کو اس کا بھی بڑا غم ہے ۔ انھوں نے اس پر بھی خون کے آنسو بہائے ہیں اور ان کی شخصیت کے کسی نہ کسی گوشے میں اس بات کا غم بھی کہیں نہ کہیں چھپا ہوا نظر آتا ہے ۔

میر کی شخصیت میں اس غم کی بھی بڑی چبھن ہے ۔ اس چبھن نے انھیں بڑی حد تک تخیلی اور رومانی بھی بنا دیا ہے کیونکہ اس مزاج کے لوگوں کا تخیلی اور رومانی ہو جانا ، ایسی کوئی عجیب بات نہیں ۔

خیر ، تو قصہ مختصر یہ کہ میر اس شخصیت کے مالک تھے ۔ اس شخصیت کا انسان دنیا کے کام کا نہیں رہتا ۔ زندگی اس کے لیے اور وہ خود زندگی کے لیے بوجھ بن جاتا ہے ۔ وہ رو رو کر زیست کرتا ہے ۔ بلکہ رونا ہی اس کی زندگی بن جاتا ہے ۔ وہ گریہؑ و زاری کے سہارے جیتا ہے ۔ رنج و الم اس کے رفیق بن جاتے ہیں ۔ ایسے شخص کو مسرت کا منہ دیکھنا نصیب نہیں ہوتا ۔ بلکہ مسرت میں بھی اسے غم کی صورت نظر آتی ہے ۔ اسی لیے مسرت سے آسے کوئی سروکار نہیں رہتا ۔ زندگی کے نشاطیہ پہلو ، اس کے نزدیک کوئی حیثیت نہیں رکھتے ۔ وہ زندگی کے لیے اجنبی اور انجان ہوتا ہے اور زندگی خود اس کے لیے اجنبی اور انجان بن جاتی ہے ۔ ایک ایسی شخصیت رکھنے والے انسان کی زندگی تلخیوں میں گزرتی ہے ۔ دنیا میں اس کے لیے کوئی ٹھکانا نہیں ہوتا ۔ اسے اگر کہیں پناہ ملتی ہے تو تخلیق کی دنیا میں ۔ فن اس کا سب سے بڑا مونس و دمساز ہوتا ہے ۔ اس کے سہارے زندگی کی تلخیاں اس کے لیے گوارا ہو جاتی ہیں ۔ وہ اپنی ایک دنیا بنا لیتا ہے اور اس دنیا میں آسے زندگی بسر کرنے کے آداب آ جاتے ہیں ۔

میر کو بھی یہی صورتِ حال پیش آئی ہے ۔ آن کی شخصیت کے ان تمام پہلوؤں نے مل کر انھیں شعر و شاعری اور ادب کی

طرف راغب کیا ہے اور شاعر بنا دیا ہے ۔ شاعری ان کے لیے ایک جائے پناہ بن گئی ہے ۔ اِس لیے اول و آخر وہ ایک شاعر ہی رہے ہیں اور شاعر ہونا ہی اُن پر پھبتا ہے اور انھیں زیب دیتا ہے ۔ اس کے سوا وہ اور کچھ ہو ہی نہیں سکتے تھے ۔ انھوں نے زندگی میں شعر و شاعری اور ادب کا سہارا لیا ہے اور وہ خود شعر و ادب کے لیے ایک سہارا بن گئے ہیں ۔

اور شاید یہی اُن کی شخصیت کا سب سے نمایاں پہلو ہے ! انھوں نے خود کہا ہے :

یہ میر ستم کشتہ کسو وقت جواں تھا
انداز سخن کا سبب شور و فغاں تھا
جس راہ سے یہ دل زدہ دلی میں نکلتا
ساتھ اس کے قیامت کا سا ہنگامہ رواں تھا
افسردہ نہ تھا ایسا کہ جوں آب زدہ خاک
شعلہ تھا ، بلا تھا، کوئی آشوبِ جہاں تھا

کتابیات

کتابیں جن سے اس کتاب کی تیاری میں مدد لی گئی ۔

۱- میر تقی میر : ذکر میر ، مرتبہ ڈاکٹر مولوی عبدالحق ، انجمن ترقی اردو ، اورنگ آباد ، ۱۹۲۸ع ۔

۲- میر کی آپ بیتی : ترجمہ ذکر میر : نثار احمد فاروقی ، مکتبہ برہان ، دہلی ۱۹۵۷ع ۔

۳- میر تقی میر : نکات الشعرا : مرتبہ ڈاکٹر مولوی عبدالحق : انجمن ترقی اردو ، اورنگ آباد ، ۱۹۳۵ع ۔

۴- میر تقی میر : فیض میر : مرتبہ پروفیسر سید مسعود حسن رضوی ادیب ، نظامی پریس لکھنؤ ، ۱۹۲۹ع ۔

۵- کلیاتِ میر : ہندوستانی پریس کلکتہ (مرتبہ فورٹ ولیم کالج) ، ۱۸۱۰ع ۔

۶- کلیاتِ میر : مرتبہ مولانا عبدالباری آسی ، نول کشور پریس لکھنؤ ، ۱۹۴۱ع ۔

۷- کلیاتِ میر : مرتبہ ڈاکٹر عبادت بریلوی ، اردو دنیا کراچی ، ۱۹۵۸ع ۔

۸- کلیاتِ میر : (نسخہ آشفتہ قلمی) برٹش میوزیم ، لندن ۔

۹- ڈاکٹر مولوی عبدالحق : انتخابِ کلام میر ، انجمن پریس کراچی ، ۱۹۵۰ع ۔

۱۰- مرزا جعفر علی خاں اثر : مزامیر ، کتابی دنیا لمیٹڈ ، ۱۹۴۷ع -

۱۱- اخبار اودھ : (قلمی ، رائل ایشیاٹک سوسائٹی ، لندن) -

۱۲- رسالۂ نیرنگ : میر نمبر ۱۹۲۸ع -

۱۳- درگاہ قلی خاں : مرقع دہلی -

۱۴- حسن نظامی : قدیم دلی -

۱۵- خطبات گارساں دی تاسی : انجمن ترقی اردو ، ۱۹۳۵ع -

۱۶- سفر نامہ انند رام : مخلص مرتبہ ڈاکٹر سید اظہر علی ، رام پور ، ۱۹۴۶ع -

۱۷- مرقع مخلص : مرتبہ ڈاکٹر عبادت بریلوی ، اورئینٹل کالج لاہور ، ۱۹۷۶ع -

۱۸- تذکرۂ بہار بے خزاں (قلمی) ندوۃ العلماء لکھنؤ -

۱۹- تذکرۂ خوش معرکۂ زیبا ، مؤلفہ سعادت خاں ناصر (قلمی) پٹنہ -

۲۰- تذکرۂ ہندی گویاں : مؤلفہ مصحفی ، مرتبہ ڈاکٹر مولوی عبدالحق ، ۱۹۳۳ع -

۲۱- عقد ثریا ، مصحفی ، ۱۹۳۴ع -

۲۲- تذکرہ ریختہ گویاں : مؤلفہ فتح علی حسینی گردیزی ، مرتبہ ڈاکٹر مولوی عبدالحق ۱۹۳۳ع -

۲۳- تذکرۂ مخزن نکات : مؤلفہ قائم چاند پوری مرتبہ ڈاکٹر مولوی عبدالحق ۱۹۲۹ع -

۲۴- طبقات الشعراء : مؤلفہ قدرت اللہ شوق ، مجلس ترقی ادب لاہور ، ۱۹۶۸ع -

۲۵- مجمع الانتخاب : مؤلفہ شاہ کمال (رائل ایشیاٹک سوسائٹی لندن ، قلمی) -

۲۶- تذکرۂ گلشن ہند : مؤلفہ مرزا علی لطف ، علی گڑھ ، ۱۹۲۴ع -

۲۷- عیار الشعرا : مؤلفہ خوب چند ذکا (قلمی) -

۲۸- تذکرۂ شعرائے اُردو : مؤلفہ میر حسن دہلوی ، ۱۹۴۰ع -

۲۹- ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی : دلی کا دبستانِ شاعری ، انجمن ترقی اُردو دہلی ، ۱۹۴۰ع -

۳۰- ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی : میر تقی میر - حیات اور شاعری ، علی گڑھ ، ۱۹۵۴ع -

ڈاکٹر عبادت بریلوی
کی کتابیں

۱ - اقبالیات -

جشن نامۂ اقبال (اردو) شائع کردہ یونیورسٹی اورینٹل کالج ، لاہور
جشن نامۂ اقبال (انگریزی) ''
اورینٹل کالج میگزین اقبال نمبر (اردو) ''
اورینٹل کالج میگزین اقبال نمبر (انگریزی) ''
اقبال کی اردو نثر اقبال اکیڈمی ، لاہور
اقبال ـــــ احوال و افکار - مکتبۂ عالیہ ، لاہور
جہان اقبال (ادبی سوانح) (زیرِ طبع) ادارۂ ادب و تنقید ، لاہور
اقبال کی غزل '' ''
منظومات اقبال '' ''
اقبال کا فن '' ''

۲ - ادبی دریافت (نادر قلمی نسخوں کی دریافت اور ترتیب و تدوین)

شکنتلا مؤلفہ مرزا کاظم علی خان (مع مقدمہ) اردو دنیا ، کراچی
ہفت گلشن ، مؤلفہ مظہر علی خان ولا '' '' ''
مادھونل اور کام کندلا '' '' '' ''
دیوان ولا '' '' ادارۂ ادب و تنقید ، لاہور
گلزار چین مؤلفہ خلیل علی خان اشک: اورینٹل کالج ، لاہور
رسالۂ کائنات '' '' ''

شکوہ فرنگ مؤلفہ آغا حجو شرف " "
چار گلشن ، مؤلفہ بینی نارائن جہاں مع مقدمہ اورینٹل کالج ، لاہور
دیوان مبتلا مؤلفہ عبیداللہ خان مبتلا " "
دیوان حیدری مع مقدمہ مؤلفہ سید حیدر بخش حیدری آردو دنیا ،
حیدری " " کراچی
مختصر کہانیاں " " "
تذکرۂ گلشنِ ہند " " "
گلزار دانش (دفتر اول) مع مقدمہ مؤلفہ سید حیدر بخش حیدری
اورینٹل کالج ، لاہور
گلزار دانش (دفتر دوم) " " "
مُرقع مخلص مؤلفہ آنند رام مخلص مع مقدمہ و حواشی "
ڈاکٹر جان گلکرسٹ کی انگریزی نظمیں ۔ مؤلفہ ڈاکٹر جان گلکرسٹ
Dr. John Culctrist : Unpublished Poems
نقلیات ہندی جلد اول و دوم مؤلفہ ڈاکٹر جان گلکرسٹ : "
افسانۂ عشق ، مؤلفہ الٰہی بخش شوق اکبر آبادی مع مقدمہ "
سیاست نامہ مؤلفہ نواب کریم خاں مع مقدمہ : ادارۂ ادب و تنقید ، لاہور
نالۂ درد مؤلفہ حضرت خواجہ میر درد (آردو ترجمہ مع مقدمہ) "
نکات الشعراء مؤلفہ میر تقی میر (مع مقدمہ و حواشی) "
دیوان فارسی مؤلفہ حضرت خواجہ میر درد " "
جشن نامہ اورینٹل کالج (جلد اول) اورینٹل کالج ، لاہور
جشن نامہ اورینٹل کالج (جلد دوم) " "
خطوط عبدالحق بنام ڈاکٹر عبداللہ چغتائی " "

۳ ۔ تحقیق و تنقید ۔

آردو تنقید کا ارتقا : انجمن ترقی آردو پاکستان ، کراچی
روایت کی اہمیت : ”
غزل اور مطالعۂ غزل : ”
خطبات عبدالحق : مع مقدمہ ”
مقدمات عبدالحق : مع مقدمہ اردو مرکز ، لاہور
انتخاب خطوط غالب ” ”
تنقیدی زاویے پہلا اڈیشن : مکتبہ اردو ، لاہور
دوسرا اڈیشن : آردو مرکز ، لاہور
تنقیدی تجربے آردو دنیا ، کراچی
مومن اور مطالعۂ مومن ”
جدید شاعری ”
کلیات میر مع مقدمہ ”
کلیات مومن ” ”
شاعری اور شاعری کی تنقید ”
سحرالبیان — ایک تنقیدی مطالعہ : اورینٹل کالج ، لاہور
غالب اور مطالعۂ غالب : رائٹرز اکیڈمی ، لاہور
غالب کا فن : گلوب پبلشرز ، لاہور
اقبالؒ کی آردو نثر : اقبال اکیڈمی ، لاہور
اقبالؒ — احوال و افکار : مکتبۂ عالیہ ، لاہور
میر تقی میر (حیات اور شاعری) : ادارۂ ادب و تنقید ، لاہور
ولی اورنگ آبادی ” ” ”

حضرت خواجہ میر دردؒ " "

ادب اور ادبی تدریس " "

تنقید اور اصولِ تنقید " "

جہانِ میر " "

افسانہ اور افسانے کی تنقید " "

شاعری کیا ہے ؟ " "

میر کی غزل " "

منظوماتِ میر " "

نظیر اکبر آبادی " "

جدید اردو ادب " "

فورٹ ولیم کالج کی ادبی خدمات " "

میر امن دہلوی " "

سید حیدر بخش حیدری " "

ڈاکٹر جان گلکرسٹ " "

۴ - رپورتاژ ڈائری وغیرہ

ارضِ پاک سے دیارِ فرنگ تک : گلوب پبلشرز ، لاہور

جشن صد سالہ اورینٹل کالج ، لاہور : اورینٹل کالج ، لاہور

جشنِ اقبالؒ نئی دہلی : "

آزادی کے سائے میں زیرِ طبع ادارۂ ادب و تنقید ، لاہور

اورینٹل کالج میں تیس سال " "

لندن میں پانچ سال " "

لندن کی ڈائری ادارۂ ادب و تنقید ، لاہور

* * *